

استاد شهید مرتضی مطهری

عبادت و دعا



عبادت و نماز

تقاریر

استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

ترجمہ

سید سعید حیدر زیدی

ناشر

مطہریؒ فکری و ثقافتی مرکز۔ کشمیر

نام کتاب: عبادت و نماز
استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ
ناشر: مطہریؒ فکری و ثقافتی مرکز
طبع اول: دسمبر، 2011
تعداد: 1000

فہرست

عرض ناشر

زیرنظر رسالہ عبادت اور نماز کے موضوع پر استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ کی چار تقاریر کا مجموعہ ہے۔ یہ تقاریر رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ میں حسینیہ ارشاد تہران میں کی گئیں۔ ان تقاریر میں شہید مطہریؒ نے اسلام میں عبادات و معنویات کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے، خداوند عالم پر ایمان اور عبادات کے تربیتی اثرات پر گفتگو کی ہے اور دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر فقط انہیں عبادت و عرفان میں ڈوب کر رہ جانے، یا انہیں یکسر نظر انداز کر دینے کی نفی کرتے ہوئے ان میں ایک اعتدال قائم کیا ہے اور اسلام کو ایک جامع اور دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی اور فلاح کے طالب ہونے کی حیثیت سے پہچنوایا ہے۔

تقریر اور تحریر، اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانے کے دو ذرائع ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا علیحدہ انداز اور مخصوص اثر ہوا کرتا ہے۔ مقرر اپنی حرکات و سکنات اور چشم و ابرو کی جنبش کے ذریعہ بھی پیغام دیتا ہے، جب

کہ تحریر اس سہولت سے محروم ہوتی ہے۔ لہذا کسی تقریر کو اس کی پوری تاثیر کے ساتھ قلم بند کرنا ممکن نہیں۔ زیر نظر تقاریر کا ترجمہ کرتے ہوئے کوشش کی گئی ہے کہ ان کا تقریری انداز بھی محفوظ رہے اور ان میں کی جانے والی گفتگو بھی تحریر کی صورت میں پوری پوری منتقل کی جائے۔ ہم اس کوشش میں کس حد تک کامیاب رہے ہیں یہ فیصلہ تو خود قارئین ہی کریں گے۔

امید ہے ہماری دوسری مطبوعات کی طرح یہ کتاب بھی قارئین میں مقبول ہوگی۔

والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عبادت ونماز

(۱)

الحمد للّٰہ رب العالمین باری الخلائق اجمعین والصلاۃ والسلام علی عبد اللہ و رسولہ و حبیبہ و صفیہ و حافظ سرہ و مبلغ رسالاتہ سیدنا و نبینا و مولانا ابی القاسم محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم و علی آلہ الطیبین الطاہرین المعصومین، اعوذباللہ من الشیطان الرجیم:

”یا ایھا الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلوۃ“ (۱)

جیسا کہ آپ نے سنا، مجھے آج رات یہاں تقریر نہیں کرنا تھی۔ میری تقریر کل رات سے شروع ہونا تھی۔ آئندہ پانچ راتوں کے لئے جس موضوع بحث کا اعلان ہوا تھا وہ ”عبادت اور دعا“ تھا۔ اس ماہ کی مناسبت سے، جو ماہ مبارک رمضان ہے، ماہ عبادت ودعا ہے، اور بالخصوص ان ایام اور شبوں کی

---

(۱) ”اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعہ مدد مانگو۔“ (سورہ بقرہ، ۱۵۳)

مناسبت سے، جو ایام وشبہائے قدر ہیں، یہ شبیں احیا کی شبیں ہیں، یعنی وہ راتیں جن میں مستحب ہے کہ ہم ان راتوں کو جاگ کر گزاریں۔ ''احیا''، یعنی زندہ کرنا، اور ان شبوں میں احیا کے معنی ہیں، ان شبوں کو جاگ کر گزارنا، ان میں شب بیداری کرنا۔ اس مناسبت سے طے تھا کہ ہم عبادت اور دعا کے بارے میں گفتگو کریں لیکن تقدیر میں یہ تھا کہ یہ گفتگو آج ہی رات سے شروع ہو جائے۔

احیاء

ہم اپنی بحث کا آغاز اسی لفظ ''احیا'' سے کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا ''احیا''، یعنی زندہ کرنا، اس کی ضد ''اماتہ''، یعنی مارنا، ہے۔ اس لفظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رات، جو انسان کے وقت کا ایک حصہ ہے، اس کی دو حالتیں ہیں، ممکن ہے کسی کی شب زندہ ہو، اور ممکن ہے اس کی شب مردہ ہو۔ زندہ شب، وہ شب ہے جس میں انسان پوری رات، یا کم از کم اس رات کے ایک حصہ کو ذکر الٰہی، مناجات اور ذات پروردگار سے راز و نیاز میں بسر کرے۔ اور مردہ شب، وہ شب ہے جس میں انسان تمام رات پروردگار کی مقدس ذات سے غفلت اور فراموشی کی حالت میں رہے۔

ممکن ہے کوئی یہ خیال کرے کہ یہ تعبیر ایک مجازی تعبیر ہے۔ایک قسم کا تکلف ہے۔کوئی رات زندہ اور مردہ نہیں ہوتی، رات آخر رات ہے، وقت ہے۔ وقت کا وہ حصہ جس میں کرہ زمین کا وہ نصف حصہ جس پر ہم زندگی بسر کرتے ہیں سورج کے سامنے نہیں ہوتا اور اس پر سورج کی روشنی نہیں پڑتی، اسے رات کہا جاتا ہے۔رات بہرصورت رات ہے، رات کی نہ زندگی ہوتی ہے اور نہ موت۔

یہ بات واضح ہے۔لیکن وہ شخص جواحیا اور رات میں جاگتے رہنے کے لفظ کو اپنی زبان پر لاتا ہے اس کی مراد یہ نہیں ہے کہ آپ وقت کے اس حصہ کو جگا کے رکھئے، بلکہ جاگے رہنے سے مراد وقت کے اس حصہ میں خود آپ کو جاگتے رہنا ہے۔

ہم خیال کرتے ہیں کہ وقت ایک چیز ہے جس کے اندر ہم سب داخل ہیں، جب کہ ایسا نہیں ہے۔وہ وقت جس کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ ہم سب اس کے اندر داخل ہیں، وہ ہمارا وقت نہیں ہے۔ وہ وقت جس کی بنیاد پر حساب لگاتے ہیں، گھنٹوں، منٹوں، ہفتوں، مہینوں اور سالوں کا حساب کرتے ہیں ہمارا وقت نہیں ہے، وہ اس زمین کا وقت ہے۔ ہمارا وقت ہمارے اپنے وجود سے متحد ایک حقیقت ہے، ہمارے وجود کا حصہ ہے۔ ہمارا وقت، ہمارے وجود کا وقت، خود ہم سے جدا نہیں

معاویہ سے ملاقات ہوتی ہے۔ معاویہ کو معلوم تھا کہ ''ضرار'' حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب میں سے ہیں۔ چنانچہ فرمائش کی: تم علیؑ کے ساتھ رہتے تھے، میرے سامنے ان کے فضائل بیان کرو۔ خود معاویہ اچھی طرح حضرت علی علیہ السلام سے واقف تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ دوسروں سے ان کے بارے میں سننا پسند کرتا تھا کیونکہ وہ دل کی گہرائیوں سے حضرت علی علیہ السلام کی عظمت کا قائل تھا، اگرچہ یہ وہی تھا جس نے حضرت علی علیہ السلام کے خلاف تلوار اٹھائی تھی۔

انسان ایسا ہی موجود ہے! وہ علی کا عقیدتمند بھی تھا، لیکن اس کے باوجود اس نے حضرت علی علیہ السلام کے خلاف ناپسندیدہ اقدامات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

''ضرار'' نے معاویہ کے سامنے اپنا ایک مشاہدہ نقل کیا۔ کہا: میں نے ایک رات علیؑ کو محراب عبادت میں دیکھا 'یتململ تململ السلیم ویبکی بکاء الحزین'' یعنی آپ محراب عبادت میں خوف خدا سے، ایک ایسے شخص کی مانند تڑپ رہے تھے جیسے سانپ نے کاٹ لیا ہو۔ غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے ایک انسان کی مانند گریہ وزاری میں مشغول تھے، سرد آہیں بھرتے تھے، آتش جہنم سے لرزاں ہوکر آہ آہ کرتے تھے۔ مولائے کائنات کی یہ کیفیت سن کر معاویہ کی آنکھوں سے بھی

آنسوں رواں ہو گئے۔

اسی طرح جب حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد ایک موقع پر معاویہ اور عدی بن حاتم کی ملاقات ہوئی تو معاویہ نے عدی بن حاتم کو حضرت علی علیہ السلام کے خلاف بھڑکانا چاہا۔ عدی سے کہا: "**این الطرفات**؟ "طریف، طرفہ اور طارف کیا ہوئے؟(۱)

حضرت عدی بن حاتم نے جواب دیا: وہ سب صفین میں علی علیہ السلام کی رکاب میں شہید ہو گئے۔

معاویہ نے کہا: علیؑ نے تمہارے ساتھ ناانصافی کی، اپنے بچوں حسن اور حسین کو تو پیچھے رکھا اور تمہارے بچوں کو آگے کر کے موت کے منہ میں ڈھکیل دیا۔

حضرت عدی بن حاتم نے جواب دیا: حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے علی علیہ السلام کے ساتھ ناانصافی کی۔ اگر میں انصاف کرتا تو آج میں زندہ اور علیؑ زیر خاک نہ ہوتے۔

---

(۱) حضرت عدی بن حاتم کے تین فرزند تھے، جن کا نام طریف، طرفہ اور طارف تھا۔ ان کے ان تینوں فرزندوں نے حضرت علیؑ کی رکاب میں جنگ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا تھا۔ معاویہ عدی بن حاتم کے جذبات بھڑکانا چاہتا تھا۔ لہٰذا ان کے زخموں پر نمک پاشی کی تاکہ ان کے منہ سے حضرت علی علیہ السلام کے خلاف ایک لفظ ہی نکلوا سکے۔

معاویہ نے جب اپنا نشانہ چوکتے ہوئے دیکھا تو عدی سے کہا: اے عدی! میرا دل چاہتا ہے کہ تم مجھے علیؑ کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ عدی بن حاتم نے تفصیل کے ساتھ حضرت علی علیہ السلام کے اوصاف بیان کئے۔ وہ کہتے ہیں کہ آخر میں، میں نے دیکھا کہ معاویہ زار و قطار رو رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے آستین سے اپنے آنسو صاف کئے اور کہا: افسوس کہ زمانہ علیؑ کی مانند انسان پیدا کرنے سے عاجز ہے۔

دیکھئے حقیقت کیسے جلوہ گر ہوتی ہے؟

یہ تو تھی حضرت علی علیہ السلام کی عبادت، لیکن کیا علی صرف اہل محراب تھے، محراب کے سوا کہیں اور نظر نہ آتے تھے؟

ہم حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کے ایک اور رخ کا جائزہ لیتے ہیں (اور وہ آپ کی اجتماعی حیات سے تعلق رکھتا ہے) آپ ہر لحاظ سے ایک سماجی شخص تھے، ضرورتمندوں، بیکسوں، مسکینوں اور لاچاروں کے حالات سے سب سے زیادہ واقف تھے۔ خلیفہ ہونے کے باوجود آپ دن کے وقت اپنا دُرّہ کاندھے سے لٹکائے، بنفس نفیس لوگوں کے درمیان گشت فرماتے تھے۔ ان کے معاملات کا جائزہ لیتے تھے۔ جب تاجروں کے پاس پہنچتے تو فرماتے:

"الفقه ثم المتجر" (وسائل الشیعہ، ج ۱۲، ص ۲۸۲، ح ۱)

جاؤ پہلے تجارت کے مسائل سیکھو، شرعی احکام کی تعلیم حاصل کرو، اس کے بعد آ کے تجارت کرنا۔ حرام خرید و فروخت نہ کرو، سودی معاملہ نہ کرو۔

اگر کسی تاجر سے اپنے کام پر جاتے دیکھتے تو فرماتے: "اغدوا الی عزکم"

ایک انتہائی عبادت گذار فرد ہونے کے ساتھ ساتھ آپ میں یہ خصوصیت بھی تھی۔ پہلی مرتبہ میں نے مذکورہ حدیث مرحوم آیۃ اللہ العظمیٰ بروجردی علیہ الرحمہ کی زبانی سنی تھی۔ ایک مرتبہ ایک گداگر آقائے بروجردی کے یہاں آیا اور کچھ طلب کرنے لگا۔ انہوں نے اس پر نگاہ ڈالی، دیکھا تو محسوس کیا کہ یہ شخص محنت مزدوری کر سکتا ہے لیکن گداگری کو اس نے اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ لہٰذا انہوں نے اسے نصیحت کی اور بہت سی دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ حضرت علی علیہ السلام کا یہ جملہ بھی فرمایا: کہا کہ امیر المومنین لوگوں سے فرماتے تھے:

"اغدوا الی عزکم" (۱)

علی الصبح اپنی عزت و شرف کی طرف روانہ ہو جایا کرو۔ یعنی اپنے کام، محنت مزدوری اور حصول روزگار کی طرف جایا کرو۔ انسان اس وقت

---

(۱) وسائل الشیعہ، ج ۱۲، ص ۴، ح ۱۰

عزیز و سربلند ہے جب وہ خود کماتا ہو، اپنی معاش کا بندوبست خود کرتا ہو۔ محنت مزدوری عزت ہے، شرافت ہے۔

اسے کہتے ہیں حقیقی مثالی مسلمان۔

حضرت امیر المومنین عبادت کے میدان میں سرفہرست عبادت گذار نظر آتے ہیں۔ جب قضاوت کی مسند پر جلوہ افروز ہوتے ہیں تو ایک عادل قاضی دکھائی دیتے ہیں، ذرہ برابر ناانصافی نہیں کرتے۔ جب میدان جنگ کا رخ کرتے ہیں تو ایک بہادر سپاہی اور شجاع سپاہ سالار کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں، بہترین کمانڈر نظر آتے ہیں، خود فرماتے ہیں: میں نے ابتدائے شباب ہی سے جنگ کی ہے، جنگ کا تجربہ رکھتا ہوں۔ اور جب آپ خطابت کی کرسی پر تشریف فرما ہوتے تو لگتا ہے آپ جیسا کوئی خطیب نہیں۔ جب تدریس کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں تو لگتا ہے آپ جیسا کوئی معلم اور استاد نہیں۔

ہر ایک فضیلت میں آپ کا یہی حال ہے۔ یہ ہیں اسلام کا کامل نمونہ اور اس کی صحیح تصویر۔

اسلام کسی صورت "نؤمن ببعض و نکفر ببعض" کو نہیں مانتا۔ لہٰذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم اسلام کے اس ایک پہلو کو تو مانیں گے لیکن اس کے دوسرے پہلو کا انکار کریں گے۔ دنیائے اسلام میں پیدا ہونے والے

انحراف کا نقطۂ آغاز یہی ہے۔ اگر ہم اسلام کے کسی ایک پہلو کو لے لیں لیکن اس کے دوسرے پہلو کو چھوڑ دیں تو اس طرح ہر چیز میں خرابی اور بگاڑ پیدا کر بیٹھیں گے۔

جس طرح گذشتہ زمانہ میں ہمارے بہت سے زاہد پیشہ افراد کا شیوہ غلط تھا ایسے لوگوں کی روش غلط تھی جو پورے اسلام کو مثلاً مفاتیح الجنان میں منحصر سمجھتے ہیں، دعاؤں کی ایک کتاب میں محدود کر دیتے ہیں، اسی طرح ایسے لوگوں کی روش بھی غلط ہے جو دعا، عبادت، نوافل اور فرائض کو یکسر چھوڑ کر اسلام کے صرف اجتماعی مسائل پر ہی توجہ رکھتے ہیں۔

اسلامی معاشرہ کی خصوصیات

سورہ مبارکہ ''فتح'' میں ارشاد الہٰی ہے:

''محمد رسول اللهِ والذِين معه اشِداء على الكفارِ رحماء بينهم''

''محمد اللہ کے رسولؐ ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لئے سخت رویہ رکھنے والے مگر آپس میں انتہائی مہربان ہیں۔'' (سورہ فتح ۹۲)

اس آیت میں ایک اسلامی معاشرے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ سب

سے پہلے جس مسئلہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ پیغمبر کی معیت اور آپؐ پر ایمان ہے، اس کے بعد "اشداء علی الکفار" یعنی بے گانوں کے مقابلہ میں سخت قوی اور طاقتور ہونے کا ذکر ہے۔

لہٰذا وہ خشک مقدس لوگ جو مسجد میں ڈیرہ جمائے رہتے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود صرف ایک سپاہی کی للکار پر دم دبا لیتے ہیں اور چوں بھی نہیں کرتے، وہ مسلمان نہیں۔

قرآن کریم نے ایک مسلمان کی ایک خصوصیت، بلکہ اولین خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ وہ دشمن کے مقابلہ میں سخت، پائیدار اور ثابت قدم ہوتا ہے۔ اسلام ست اور کمزور مسلمان کو پسند نہیں کرتا:

"ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین"

"خبردار سستی نہ کرنا مصائب پر محزون نہ ہونا، اگر تم صاحب ایمان ہو تو سربلندی تمہارے ہی لئے ہے۔" (سورہ آل عمران ۱۳۹)

اسلام میں سستی اور کمزوری کی کوئی گنجائش نہیں۔ ویل ڈیورنٹ اپنی کتاب "تاریخ تمدن" میں کہتا ہے: کسی بھی دین نے اپنے ماننے والوں کو قوت وطاقت کے حصول کی ایسی دعوت نہیں دی، جتنی اسلام نے دی ہے۔

گردن ڈھلی رکھنا، گوشہ لب سے رال ٹپکنا، گریبان کا ایک طرف ڈھلکا ہونا، گندہ ہونا، خود کو غریب ولاچار ظاہر کرنا، زمین پر پیر گھسیٹ کر

چلنا، عبا سر پر ڈال لینا، یہ سب چیزیں اسلامی تعلیمات کے برعکس ہیں۔ بلاوجہ آہیں بھرنا اسلام کے خلاف ہے۔

"واما بِنعمةِ ربِك فحدِث"

"اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کو مسلسل بیان کرتے رہنا۔"

(سورہ ضحیٰ ۱۱)

خدا نے آپ کو صحت دی ہے، جسمانی سلامتی دی ہے، قوت عطا کی ہے، طاقت و توانائی سے نوازا ہے۔ آپ اپنی کمر سیدھی رکھ سکتے ہیں تو کیوں بلاوجہ اسے جھکاتے ہیں؟ آپ اپنی گردن سیدھی رکھ سکتے ہیں، کیوں بغیر کسی وجہ کے اسے ایک جانب لٹکا رکھتے ہیں؟ کیوں بے وجہ آہ و نالہ بلند کرتے ہیں؟ آہ و نالہ تو انسان تکلیف کی حالت میں بلند کرتا ہے۔ خدا نے آپ کو کسی درد اور تکلیف میں مبتلا نہیں کیا ہے، تو پھر کیوں آپ آہیں بھرتے ہیں؟ یہ تو نعمات الٰہیہ کا کفران ہے۔ کیا حضرت علی علیہ السلام بھی اسی طرح چلتے تھے جیسے یہ چلتے ہیں؟ کیا علیؑ اسی طرح عبا سر پر ڈالتے تھے اور اسی طرح ٹیڑھے ہو کر چلتے ہوئے راستہ طے کرتے تھے؟(۱) ان چیزوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

---

(۱) شہید مطہری نے ان سطور میں اپنے دور کے بعض عالم نما افراد کی تصویر کشی کی ہے۔ (مترجم)

"اشداء علی الکفار" یعنی بے گانوں کے مقابل سخت، شدید اور مضبوط ہوتے ہیں۔

ایک مرد مسلم کو حلقۂ احباب میں، مسلمانوں کے ساتھ، کس طرح ہونا چاہیے؟ "رحماء بینھم" یعنی آپس میں مہربان، گھرے دوست لہٰذا مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

اس کے برخلاف جب ہم اپنے بعض مقدس نما لوگوں سے ملتے ہیں، ان کے یہاں جاتے ہیں تو ان میں یہ اخلاص و مہربانی اور یہ نرمی نظر ہی نہیں آتی۔ ہمیشہ ان کی پیشانی پر بل پڑے رہتے ہیں، بد اخلاق ہوتے ہیں اور خطرناک نظر آتے ہیں۔ کسی کے ساتھ گرم جوشی سے پیش نہیں آتے، کسی سے ہنس کے نہیں ملتے، دنیا کے ہر انسان پر اپنا احسان سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ مسلمان نہیں، یہ لوگ خود کو اسلام سے وابستہ ظاہر کرتے ہیں۔

بہر حال یہ تھی ایک مسلمان میں پائی جانے والی دوسری خصوصیت۔

کیا یہی کافی ہے؟

کیا مسلمان ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ انسان کفار کے ساتھ سختی سے پیش آئے اور اہل اسلام سے مہربانی اور پیار محبت کا برتاؤ رکھے؟ جی نہیں:

"تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلاً مِن اللہِ ورِضوانا"

''تم انہیں دیکھو گے کہ بارگاہ احدیت میں سر جھکائے ہوئے سجدہ ریز ہیں اور اپنے پروردگار سے فضل و کرم اور اس کی خوشنودی کے طلبگار ہیں۔'' (سورۂ فتح ۹۲)

وہ شخص جو بے گانوں کے لئے سخت دل اور اپنوں کے لئے مشفق و مہربان ہے اسی کو جب محراب عبادت میں دیکھو گے تو رکوع و سجود، دعا وعبادت اور مناجات میں بھی مشغول پاؤ گے۔ ''رکعا و سجدا'' اس کی عبادت ہے'' یبتغون فضلا من اللہ و رضوانا'' اس کی دعا ہے۔

البتہ ہم دعا اور عبادت کے درمیان حد بندی کے قائل نہیں ہیں۔ دعا عبادت ہے اور عبادت بھی دعا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک عمل فقط اور فقط خالص دعا ہوتا ہے۔ یعنی ایک ایسی عبادت ہوتی ہے جو صرف دعا پر مشتمل ہے۔ لیکن کچھ عبادات ایسی ہیں جن میں دعا اور دعا کے علاوہ دوسری چیزیں بھی پائی جاتی ہیں، جیسے نماز۔ اسی طرح اور عبادات ہیں جو بنیادی طور پر دعا نہیں، جیسے روزہ۔

''سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود'' ''سجدوں کی کثرت کی وجہ سے ان کے چہروں پر نشان پائے جاتے ہیں۔'' یہ لوگ اتنے زیادہ عبادت گذار ہیں کہ عبادت، تقوی اور خدا پرستی کے آثار ان کے چہروں سے عیاں ہیں۔ ان کو دیکھنے والا ہر شخص ان کے وجود میں خدا کی

ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ ہم اس وقت کا حساب، جس کی ایک مقدار ہوتی ہے، زمین کے وقت سے کرتے ہیں، اس کے مطابق کرتے ہیں، اس کے بعد یہ تصور کرتے ہیں کہ وقت ایک چیز ہے اور ہم سب اس کے اندر ہیں۔ نہیں میرا وقت ایک چیز ہے اور آپ کا وقت ایک دوسری چیز ہے۔ یعنی وہ خود آپ سے مخصوص ہے۔ اسی طرح جیسے آپ کا قد مثلاً ایک سو ساٹھ سینٹی میٹر ہے، یہ کمیت اور مقدار آپ کی چیز ہے، اور میرا قد جو ایک سو ستر سینٹی میٹر ہے، وہ مجھ سے مخصوص ہے۔ آپ کا ایک قد اور سائز ہے، اور میرا بھی اپنا ایک مخصوص قدر اور سائز ہے (اب یہ ایک دوسرے کے برابر ہوں یا نہ ہوں، ایک علیحدہ بات ہے) آپ کا وجود کیونکہ ایک متحرک، سیال اور متغیر وجود ہے، اس لئے خود آپ کے اندر ایک وقت ہے اور میں بھی اپنے اندر ایک وقت رکھتا ہوں۔ وہ پھول بھی اپنے اندر ایک وقت رکھتا ہے، وہ درخت بھی اپنے اندر ایک وقت رکھتا ہے، یہ پتھر بھی اپنے اندر ایک وقت رکھتا ہے۔ اور ہر چیز کے اندر پایا جانے والا وقت، عین اس چیز کا وجود ہوتا ہے۔

اب جب کہ ہم نے اس نکتہ کو سمجھ لیا ہے تو پھر شب قدر میں احیا کے معنی بھی ہماری سمجھ میں آجانے چاہئے۔ وقت کو زندہ رکھیں، یعنی ہم خود اپنے وقت کو زندہ رکھیں، ہم میں سے ہر ایک اپنے اندر موجود وقت کو زندہ رکھے۔ وہ

معرفت اور الہی تجلیات کا نظارہ کرتا اور انہیں دیکھ کر یاد خدا میں ڈوب جاتا ہے۔

غالباً رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے منقول ایک حدیث میں ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام کے حواریوں نے ان سے سوال کیا: "یا روح اللہ امن نجالس؟" اے روح" اللہ! ہم کس قسم کے لوگوں کے ساتھ میل جول رکھیں؟" حضرت عیسی نے فرمایا:

"من یذکرکم اللہ رؤیة ویزید فی علمکم منطقه ویرغبکم فی الخیر عمله" (۱)

ایسے شخص کے ساتھ میل جول رکھو جسے دیکھ کر خدا کی یاد میں ڈوب جاؤ اس کے علاوہ "یزید فی علمکم منطقه" جب وہ بات کرے تو اس کی باتوں سے استفادہ کرو، اس کی گفتگو تمہارے علم میں اضافہ کرے۔ "یرغبکم فی الخیر عمله" اس کا کردار دیکھ کر، تمہارے اندر بھی نیک کاموں کا شوق پیدا ہو۔

پھر آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

"ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ

---

(۱) اصول کافی، ج ۴، کتاب فضل العالم، باب مجالس العلما وصحبتهم

خرج شطه فآزره فاستغلظ فاستوی علی سوقِهٖ یعجب الزراع لِیغِیظ بِہِم الکفار“

”یہی ان کی مثال توریت میں ہے اور یہی ان کی صفت انجیل میں ہے۔ جیسے کوئی کھیتی ہو جو پہلے ڈنٹھل نکالے، پھر اسے مضبوط بنائے، پھر وہ موٹی ہو جائے اور پھر اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے کہ کاشتکاروں کو خوش کرنے لگے تاکہ ان کے ذریعہ کفار کو جلایا جائے۔ (سورۂ فتح ۲۹)

توریت وانجیل میں ان کی یہی صفت بیان کی گئی ہے، ایک ایسی ملت کے وجود میں آنے کی بات کی گئی ہے۔ ان کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے، اس انداز میں توصیف کی گئی ہے۔ ان کی مثال ایک زراعت کی ہے، گندم کے ایک دانہ کی مانند ہیں جسے زمین میں بویا جاتا ہے اور کیونکہ یہ دانہ زندہ ہوتا ہے اس لئے ایک باریک پتی کی صورت میں اپنا سر، زمین سے باہر نکالتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ ایک سخت پتے کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اس میں استحکام آجاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ ایک موٹی ڈالی بن جاتا ہے۔ اس کے بعد خود اپنے قدموں پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ابتدا میں وہ زمین پر پڑا ہوا ایک معمولی سا پتہ تھا، جسے ثبات واستحکام حاصل نہ تھا۔ بعد میں یہ ایسا پھلتا پھولتا ہے کہ انسان شناسی کے تمام ماہرین کو حیرت زدہ کر دیتا ہے اور وہ فکر میں ڈوب جاتے ہیں کہ یہ کیسی پختہ اور شاندار قوم وجود میں آئی ہے۔

البتہ حیرت واستعجاب کا باعث ایسی ہی قوم ہوسکتی ہے جو" اشداء علی الکفار" بھی ہو،" رحماء بینھم" بھی ہواور" رکعا سجدا" اور "یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا" بھی ہو۔اس میں یہ تمام صفات پائی جاتی ہوں۔

اب بتایئے ہم مسلمان اس قدر زوال وانحطاط کا شکار کیوں ہیں؟ اس قدر بد بخت اور ذلیل وخوار کیوں ہیں؟ بتایئے ان مذکورہ خصوصیات میں سے کون سی خصوصیت ہمارے اندر موجود ہے؟ اور ہم کیا توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں؟

معنویات کو ہلکا نہ سمجھئے

ہمیں سو فیصد صد اعتراف ہے کہ اسلام ایک اجتماعی دین ہے، اس کے احکام وفرامین اس کے اجتماعی ہونے کے عکاس ہیں۔لیکن یہ حقیقت اس بات کا سبب نہیں ہوسکتی کہ ہم عبادت، دعا اور خدا سے اپنے رابطہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں، انہیں معمولی سمجھنے لگیں، نماز کو بے اہمیت سمجھیں۔

نماز کو ہلکا اور معمولی سمجھنا بھی ایک گناہ ہے۔نماز نہ پڑھنا ایک بڑا گناہ ہے لیکن نماز پڑھنا مگر اسے ہلکا سمجھنا، اسے بے اہمیت سمجھنا بھی ایک

گناہ ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی وفات کے بعد آپ کے ایک صحابی جن کا نام ''ابو بصیر'' تھا، تعزیت کی غرض سے ام حمیدہ کے یہاں حاضر ہوئے۔ ام حمیدہ رونے لگیں۔ ابو بصیر، جو نابینا تھے وہ بھی رونے لگے۔ اس کے بعد ام حمیدہ نے ابو بصیر سے کہا: اے ابو بصیر! تم نے اپنے امام کے آخری لمحات کو نہیں دیکھا، اس وقت ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ امام تقریباً غش کی حالت میں تھے، اسی اثنا میں آپ نے آنکھیں کھولیں اور فرمایا: میرے تمام نزدیکی رشتہ داروں کو بلاؤ، سب کو میرے سرہانے جمع کرو۔ ہم نے امام کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے سب کو اکٹھا کیا۔ جب سب جمع ہو گئے تو امام نے اسی حالت میں، جب آپ اپنی حیات مبارک کے آخری لمحات طے کر رہے تھے، اپنی آنکھوں کو کھولا، اردگرد جمع ہونے والوں کی طرف رخ کیا اور صرف ایک جملہ ارشاد فرمایا:

''ان شفاعتنا لا تنال مستخفا بالصلوۃ''

''ہماری شفاعت کسی بھی صورت میں ان لوگوں کو نہیں ملے گی جو نماز کو ہلکا سمجھتے ہیں۔'' (وسائل الشیعہ، ج ۳، ص ۱۷، ح ۱۱)

امام نے صرف اتنا کہا اور جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔

امام نے یہ نہیں فرمایا کہ ہماری شفاعت ان لوگوں کو نہیں ملے گی جو

نماز نہیں پڑھتے۔ان لوگوں کا معاملہ تو بالکل واضح ہے۔ بلکہ فرمایا کہ ایسے لوگ جو نماز کو ہلکا اور معمولی سمجھتے ہیں وہ ہماری شفاعت نہیں پا سکیں گے۔

کون لوگ ہیں جو نماز کو ہلکا سمجھتے ہیں؟

نماز کو معمولی اور بے اہمیت سمجھنے والے وہ لوگ ہیں جن کے پاس وقت ہوتا ہے، اطمینان کے ساتھ اور اچھے طریقہ سے نماز پڑھ سکتے ہیں، لیکن پھر بھی ایسا نہیں کرتے۔ظہر عصر کی نماز اس وقت پڑھتے ہیں جب سورج غروب ہونے کو ہوتا ہے۔جب دیکھتے ہیں کہ سورج ڈوبنے والا ہے تو بھاگم بھاگ میں وضو کرتے ہیں، جھٹ پٹ نماز پڑھتے ہیں اور تیزی کے ساتھ سجدہ گاہ ایک طرف رکھ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسی نماز پڑھتے ہیں جس میں نہ تمہیدات ہوتی ہے نہ تعقیبات ، نہ اطمینان ہوتا ہے نہ حضور قلب۔ ایسا طرز عمل اختیار کرتے ہیں جیسے نماز بھی دوسرے معمولی کاموں کی طرح ایک کام ہے۔

یہ ہے نماز کو خفیف سمجھنا۔ایسی نماز، اس نماز سے بہت زیادہ مختلف ہے جس کی طرف انسان ذوق وشوق کے ساتھ جاتا ہے۔ جوں ہی ظہر کا اول وقت آتا ہے وہ مکمل اطمینان کے ساتھ جا کر وضو کرتا ہے، ایسا وضو جس میں تمام آداب کا لحاظ رکھا گیا ہو۔ اس کے بعد جا نماز پر آ کر اذان و اقامت کہتا ہے اور سکون وقناعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہے۔ سلام کہہ کر فورا

کھڑا نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اطمینان قلب کے ساتھ کچھ دیر تعقیبات نماز بھی پڑھتا ہے، ذکر خدا کرتا ہے.... یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کی نظر میں نماز کو احترام حاصل ہے۔

ایسے نمازی جو نماز کو ہلکا شمار کرتے ہیں، حقیر اور معمولی سمجھتے ہیں، وہ فجر کی نماز طلوع آفتاب کے نزدیک پڑھتے ہیں اور ظہر وعصر کی نماز غروب آفتاب کے وقت ادا کرتے ہیں، مغرب وعشا کی نماز انہیں رات کے چار گھنٹے گزر جانے کے بعد یاد آتی ہے۔ یہ لوگ برق رفتاری اور تیزی کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ ایسے لوگوں کے بچے تو نماز ہی نہیں پڑھتے۔

آپ اگر حقیقی نماز گزار بنا چاہتے ہیں، اور یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچے بھی نماز کے پابند بنیں تو آپ کو نماز کا احترام کرنا چاہئے۔ ہم آپ سے صرف یہ تقاضا نہیں کر رہے ہیں کہ نماز پڑھئے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ چاہتے ہیں کہ نماز کا احترام کیجئے۔ اس مقصد کے لئے پہلے تو خود اپنے گھر میں نماز پڑھنے کی ایک مخصوص جگہ بنایئے (یہ مستحب بھی ہے) یعنی گھر میں ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیجئے جو آپ کی عبادت گاہ ہو، مصلا نما ایک چیز اپنے لئے بنایئے۔

جیسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کے لئے ایک جگہ

معین کر رکھی تھی اگر ممکن ہو تو آپ بھی ایک کمرہ کو نماز پڑھنے کی جگہ کے طور پر مقرر کر لیجئے۔ اگر گھر میں کمرے زیادہ نہ ہوں تو خود اپنے کمرہ میں نماز کے لئے ایک خاص جگہ معین کر لیجئے۔ ایک پاک صاف جانماز وہاں رکھئے، نماز کے لئے کھڑے ہونے سے قبل اسے بچھایئے۔ آپ کے پاس ایک مسواک بھی ہو، ذکر پڑھنے کے لئے تسبیح بھی ہو۔

جب وضو کر رہے ہوں تو اسے بھی جلدی جلدی اور عجلت میں نہ کیجئے۔ ہم دعوی کرتے ہیں کہ ہم حضرت علی علیہ السلام کے شیعہ ہیں۔ عزیزو! نام رکھ لینے سے علی کا شیعہ نہیں ہوا جا سکتا، جس شخص نے حضرت علی علیہ السلام کے وضو کو بیان کیا ہے وہ کہتا ہے: علی ابن ابی طالب علیہما السلام جب وضو کے لئے تشریف لاتے تھے اور ہاتھوں پر پانی میں ڈالتے تھے تو فرماتے تھے:

"بسم اللہ وبا للہ اللّٰھم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطھرین"

"اللہ کے نام اور اللہ ہی کے سہارے سے۔ خدایا! مجھے توبہ کرنے والوں میں قرار دے، مجھے پاکیزہ رہنے والوں میں قرار دے۔"

دو دن پہلے ہم نے توبہ کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ توبہ کے معنی خود کو پاکیزہ کرنے کے ہیں۔ پانی رمز طہارت ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ جب علی پانی کا رخ کرتے ہیں تو، توبہ کو یاد کر کے اپنے ہاتھوں کو دھوتے ہوئے اپنی روح کی طہارت کی جانب متوجہ ہو کر ہم سے کہتے ہیں کہ جب اس پانی کا سامنا کرو جسے خدا نے پاکیزگی کا ذریعہ قرار دیا ہے، جب اس مادہ کی طرف جاؤ اور تمہاری نگاہ اس پر پڑے، اپنے ہاتھوں کو اس سے دھوؤ اور پاک کرو تو یہ بات ذہن میں رکھو کہ ایک اور پاکیزگی بھی ہے، ایک اور پانی بھی ہے، وہ پاکیزگی روح کی پاکیزگی ہے اور وہ پانی، توبہ کا پانی ہے۔

کہتے ہیں کہ ہاتھوں کو دھونے کے بعد علی، اپنے چہرہ پر پانی ڈالتے ہوئے فرماتے تھے:

"اللّٰھم بیض وجھی یوم تسود فیہ الوجوہ ولا تسود وجھی یوم تبیض فیہ الوجوہ"

آپ حضرات اپنے چہرہ کو دھوتے ہیں اور حسب ظاہر صاف کرتے ہیں۔ جب اپنے چہرہ کو پانی سے دھوتے ہیں تو وہ سفید و براق ہو جاتا ہے۔ لیکن علی اسی پر اکتفا نہیں کرتے، اسلام بھی اسی پر اکتفا کا قائل نہیں ہے۔ یہ عمل درست ہے اور اس پر عمل بھی کرنا چاہئے لیکن ایک اور پاکیزگی اور نورانیت کے ہمراہ ایک اور سفیدی بھی چہرہ پر ہونا چاہئے۔ فرماتے ہیں: خدایا میرے چہرہ کو اس دن نورانی فرما جس دن چہرے سیاہ ہو جائیں گے

۔اور اس دن اسے سیاہ نہ کر جس دن چہرے نورانی ہو جائیں گے۔ یہاں اس دن سے مراد روز قیامت ہے۔

اس کے بعد دائیں ہاتھ پر پانی ڈال کر فرماتے ہیں:

"اللھم اعطنی کتابی بیمینی والخلد فی الجنان بیساری وحاسبنی حسابا یسرا"

"خدایا! قیامت میں میرا نامہ اعمال میرے داہنے ہاتھ میں دینا ۔کیونکہ کامیاب اور نجات یافتہ لوگوں کا نامۂ اعمال ان کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اور جنت مجھے آسانی سے عنایت فرما اور حساب میں بھی آسانی فرما۔ اس طرح آپ آخرت کے حساب کو یاد کرتے ہیں۔"

اس کے بعد بائیں ہاتھ پر پانی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اللھم لا تعطنی کتابی بشمالی ولا من ورا ظھری ولا تجعلھا مغلولة الی عنقی واعوذبک من مقطعات النیران"

"خدایا! میرے نامۂ اعمال کو بائیں ہاتھ میں یا پشت کی طرف سے نہ دینا۔ کچھ لوگوں کا نامہ اعمال انہیں پیچھے سے پکڑایا جائے گا اور یہ بھی ایک رمز ہے۔ اور نہ اسے میری گردن سلٹکانا۔ میں جہنم کی آگ کے ٹکڑوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔"

کہتے ہیں: اس کے بعد آپ سر کا مسح کرتے ہوئے فرماتے تھے:

"اللهم غشنی برحمتك وبركاتك"

"خدایا! مجھے اپنی رحمت اور برکتوں کے سائے میں لے لے۔"

پھر پیروں کا مسح کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے:

"اللهم ثبت اقدامنا علی الصراط یوم تزل فیه الاقدام"

خدایا! میرے ان قدموں کو پر اس دن پل صراط ثابت رکھنا جس دن سارے قدم ملڑ کھڑا رہے ہوں گے۔"

"واجعل سعیی فیما یرضیك عنی"

"میرے عمل، میری کوشش و کاوش کو ان کاموں میں قرار دے جو تجھے راضی کر سکیں۔"

ایسا وضو جو اس قدر شوق اور توجہ و اہتمام کے ساتھ کیا جائے گا، وہ بارگاہ الٰہی میں ایک الگ ہی انداز کی اہمیت کا حامل ہوگا اور وہ وضو جو ہم اور آپ کرتے ہیں اس کی قبولیت کسی اور طرح کی ہوگی۔

پس نماز کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے، سبک نہیں شمار کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ انسان دوران نماز صرف اس کے واجبات کی ادائیگی پر اکتفا کی ہی کوشش کرے۔ اور جب کوئی اسے اس جانب متوجہ کرے تو وہ یہ کہے کہ آپ دیکھئے مرجع تقلید کا فتویٰ کیا ہے، کیا وہ کہتے ہیں کہ تیسری اور چوتھی رکعت میں "سبحان الله والحمد لله، ولا اله الا الله، والله اکبر" تین

وقت جو ہمارے اندر موجود ہے، وہ کیا ہے؟

وہ خود ہم ہیں، ہم سے جدا کوئی چیز نہیں ہے۔ پس ہم خود اپنے وقت کو اور اپنی شب کو زندہ رکھیں۔ یعنی ہم خود ایک رات میں واقعاً زندہ رہیں، مردہ نہ رہیں۔

اخبار و احادیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن انسان پر گزرنے والی چیزوں کو، اس پر گزرنے والے زمانہ کو اس کے سامنے پیش کیا جائے گا، اور وہاں مختلف انسان نظر آئیں گے۔ کبھی اس کو ایک ایسا موجود دکھائی دے گا جس کا کچھ حصہ سیاہ اور تاریک ہے اور کچھ حصہ سفید اور چمکدار۔ اس سے مختلف ایک انسان اپنے آپ کو دیکھے گا کہ اس کا زیادہ تر حصہ سیاہ ہے، جب کہ ایک اور انسان دیکھے گا کہ اس کا بیشتر حصہ سفید اور براق ہے۔ ممکن ہے کوئی انسان ایسا بھی ہو جسے اپنے اندر صرف چند ہی سیاہ نقطے دکھائی دیں، باقی پورا کا پورا سفید نظر آئے، جب کہ ایک دوسرا اس کے برعکس ہو اور وہ اپنے اندر صرف چند ہی سفید نقطے دیکھے، بقیہ پورا کا پورا سیاہ نظر آئے۔

وہ تعجب کرے گا اور پوچھے گا کہ یہ کیا چیز اس کے سامنے پیش کی گئی ہے؟ کہیں گے کہ یہ تمہارا وقت ہے، یہ تمہاری عمر ہے۔ وہ لمحات جن میں تم نے اس وقت کو، اس عمر کو روشن اور نورانی رکھا تھا، ان لمحات میں جب تم محو پرواز تھے، جذبہ اور ولولہ کے ساتھ تھے، عشق کے ہمراہ تھے، تمہارا دل

مرتبہ کہنا ضروری ہے؟ نہیں بلکہ ان کی نظر میں ایک ہی مرتبہ کہنا کافی ہے۔

جی ہاں! صحیح ہے کہ، مجتہد فتویٰ دیتے ہیں کہ تسبیحات اربعہ کا ایک مرتبہ پڑھنا کافی ہے۔ البتہ ساتھ میں یہ بھی کہتے ہیں کہ احتیاط مستحب یہ ہے کہ تین مرتبہ پڑھا جائے۔ لہٰذا ہمیں یہ نہیں کہنا چاہئے کہ جب مجتہد نے ایک مرتبہ کافی قرار دیا ہے تو ہم بھی صرف ایک ہی مرتبہ پڑھیں گے۔ یہ دراصل نماز سے جی چرانا ہے۔ ہمیں ایسا ہونا چاہئے کہ اگر مجتہد ایک مرتبہ پڑھنا واجب قرار دے اور مزید دو مرتبہ مستحب، تو ہم بہتر سمجھتے ہوئے مستحب کو بھی انجادیں۔

روزہ کو بھی معمولی اور خفیف نہیں سمجھنا چاہئے۔ بعض لوگوں کا روزہ رکھنے کا ایک خاص انداز ہے۔ یہ میں مزاحاً عرض کررہا ہوں کہ نعوذ باللہ اگر میں خدا کی جگہ ہوتا تو کسی صورت ان کا یہ روزہ قبول نہ کرتا۔

میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو ماہ رمضان میں رات بھر نہیں سوتے۔ البتہ ان کی یہ شب بیداری عبادت کی غرض سے نہیں ہوتی بلکہ اس لئے جاگتے ہیں کہ ان کی نیند پوری نہ ہوسکے۔ صبح تک چائے پینے اور سگریٹ نوشی میں وقت گزارتے ہیں۔ صبح طلوع ہونے کے بعد اول وقت نماز فجر پڑھ کر سو جاتے ہیں اور (پورا دن سو کر) اس وقت بیدار ہوتے ہیں جب ظہر اور عصر کی نماز کی ادائیگی کا انتہائی قلیل وقت باقی رہ جاتا ہے۔ اور

پھر برق رفتاری سے یہ نمازیں پڑھنے کے بعد افطار کے لئے آ بیٹھتے ہیں۔

آخر یہ کس قسم کا روزہ ہے؟

انسان رات بھر صرف اس لئے نہ سوئے کہ دن میں روزہ رکھ کر سوتا رہے، تاکہ روزہ کی سختی اور مشقت محسوس نہ ہو۔

کیا یہ روزہ کو ہلکا سمجھنا اور اس کی اہمیت کو گھٹانا نہیں ہے؟

میرے خیال میں تو یہ روزہ کو گالی دینے کے مترادف ہے، یعنی زبان حال سے یہ کہنا ہے کہ اے روزہ ! میں تجھ سے اس قدر نفرت کرتا ہوں کہ تیرا چہرہ تک نہیں دیکھنا چاہتا!!

ہم حج کرتے ہیں لیکن اسے حقیر جان کر، روزہ رکھتے ہیں لیکن معمولی بنا، کرنماز پڑھتے ہیں لیکن ہلکا سمجھ کر، اذان کہتے ہیں لیکن بے دلی سے۔

ہم اذان کو کیسے اتنا معمولی کام سمجھتے ہیں؟

موذن کا ''صیت'' یعنی خوش لحن ہونا مستحب ہے۔ اسی طرح جیسے قرآن مجید کی قرأت کے لئے تجوید یعنی حروف قرآن کی خوبصورتی کے ساتھ ادائیگی، خوبصورت آواز میں قرآن پڑھنا سنت ہے، جو روح پر بھی بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی طرح اذان میں بھی مستحب یہ ہے کہ موذن ''صیت'' یعنی خوش لحن ہو، اس انداز سے اذان کہے کہ سننے والوں

پر وجد طاری کر دے، ان میں خدا کی یاد تازہ کر دے۔

بہت سے افراد خوش لحن ہیں اور اچھے انداز میں اذان کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان سے کہا جائے کہ جناب آگے بڑھیے، آج آپ اذان کہہ دیجئے تو وہ تیار نہیں ہوتے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ اسے اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ دل ہی دل میں کہتے ہیں کہ کیا میں اس قدر حقیر ہوں کہ مؤذن بنوں؟

جناب! مؤذن ہونے پر تو آپ کو فخر کرنا چاہئے، علی ابن ابی طالب علیہما السلام مؤذن تھے۔ جس دور میں آپ خلیفہ تھے، اس دور میں بھی اذان کہا کرتے تھے۔ مؤذن ہونے کو اپنی توہین سمجھنا، یا موذن ہونے کو کسی خاص طبقہ سے وابستہ قرار دینا اور یہ کہنا کہ میں اشراف اور زعماء قوم میں سے ہوں، بزرگ شخصیات میں میرا شمار ہوتا ہے، میں اذان دوں؟..... یہ سب باتیں اذان کی توہین کرنا اور اسے حقیر سمجھنا ہیں۔

پس ہمیں کسی بھی صورت میں عبادات کی توہین نہیں کرنا چاہئے انہیں حقارت سے نہیں دیکھنا چاہئے۔ ہمیں ایک کامل مسلمان ہونا چاہئے۔ اسلام کی حیثیت اور قدر و قیمت اس کی جامعیت میں ہے۔ نہ تو ہمارا کردار یہ ہو کہ صرف عبادات سے چپکے رہیں، اس کے سوا تمام چیزوں کو ترک کر دیں اور نہ ہی ہمیں دور حاضر میں پیدا ہونے والے ان لوگوں کی مانند ہونا چاہیے

جنہیں اسلام کی صرف اجتماعی تعلیمات ہی نظر آتی ہیں اور عبادات کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔

انشاء اللہ آئندہ شب جب ہم اسی بحث کے سلسلہ میں معروضات پیش کریں گے تو دوسرے تمام اسلامی فرائض کی نظر سے عبادت کی اہمیت پر گفتگو کریں گے اور واضح کریں گے کہ اگرچہ عبادت، خدا کے تقرب کا ایک رکن ہے اور اس کے لئے ایک مرکب کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے قطع نظر کہ "واقم الصلو لذکری" "اور میری یاد کے لئے نماز قائم کرو۔"

(سورۂ طہ،۱۴)

کی بنیاد پر نماز کا مقصد، یاد خدا اور تقرب الٰہی ہے اور خدا کا تقرب اور اس سے نزدیکی خود اتنا بڑا مقصد ہے کہ اسے اپنے سے بڑھ کر کسی اور مقصد کی ضرورت ہی نہیں بلکہ خود یہی اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ ان سب باتوں سے قطع نظر اگر ہم عبادت کو حقیر سمجھیں تو دوسرے تمام فرائض کی ادائیگی سے بھی رہ جائیں گے۔ عبادت تمام دوسرے اسلامی احکام وفرامین کی قوہ مجریہ کا نام ہے اور ان کے نفاذ کی ضامن ہے۔

یہیں پر ہم اپنے معروضات ختم کرتے ہیں۔

خدایا! تجھے تیری بارگاہ کے عبادت گزار بندوں کے حق کا واسطہ، صاحبان قرآن کے صدقہ، اپنے پاکیزہ اور مخلص مناجات کرنے والوں کے

تصدق سے ہم سب کو حقیقی عبادت گزاروں میں قرار دے۔

بارالہا! ہمیں دین اسلام کی جامعیت سے آشنا فرما اور ایک جامع و کامل مسلمان بنا دے۔

پروردگارا! ہم سب کو خلوص نیت کی توفیق عنایت فرما۔

الٰہی! ان محترم شبوں میں ہمارے گناہوں کو بخش دے، ہمارے مرحومین کی مغفرت فرما۔

رحم الله من قرا الفاتحة مع الصلوات

عبادت ونماز

(۴)

"ان الصلاۃ تنھی عن الفحشاءِ والمنکرِ ولذِکر اللّٰہِ اکبر"(۱)

عبادت اور تربیت

اسلام میں عبادات اصل اور بنیاد کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے تربیتی پہلو کا حصہ بھی ہیں۔اس بات کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ: عبادات کے اصلی اور بنیادی حیثیت کی حامل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے ہر پہلو اور انسانی زندگی کے مسائل سے قطع نظر خود عبادت مقاصد خلقت میں سے ہے۔

---

(۱) بے شک نماز برائی اور بدکاری سے روکنے والی ہے اور اللہ کا ذکر بہت بڑی شے ہے۔ (سورہ عنکبوت ۴۵)

"وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون"

''اور میں نے جنات اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔'' (سورۂ ذاریات ۵۶)

عبادت انسان کے حقیقی کمال اور تقرب الٰہی کا ایک وسیلہ ہے۔

ایسی چیز جو خود انسان کے کمال کا مظہر اور ہدف اور غایت ہو اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کسی دوسری چیز کا مقدمہ اور وسیلہ بھی ہو لیکن صرف عبادت ایسی چیز ہے جو اس اصالت کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ دوسری چیز کا مقدمہ بھی ہے۔ یعنی جیسا کہ ہم نے عرض کیا (عبادات) اسلام کے تربیتی پہلو کا حصہ ہیں۔ یعنی اسلام، جو اخلاقی اور اجتماعی لحاظ سے افراد کی تربیت کرنا چاہتا ہے، اس مقصد کے لئے جو وسائل اختیار کرتا ہے ان میں سے ایک وسیلہ عبادت ہے اور اتفاق سے یہ وسیلہ انسان کے اخلاق اور ورح پر ہر دوسرے وسیلہ سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے؟ ہم آئندہ سطور میں اس کی وضاحت کریں گے۔

اخلاقی مسائل کا محور ''ایثار و فداکاری'' اور اپنے ذاتی مفاد کو پس پشت ڈالنا ہے۔ جس طرح ''حمیہ'' یعنی پرخوری سے اجتناب، جسمانی سلامتی کا ایک اصول ہے، جو جسمانی صحت سے متعلق تمام خوبیوں کی اساس اور بنیاد ہے، اسی طرح اخلاق میں بھی ایک چیز ہے، جو تمام اخلاقی مسائل

کی اصل و بنیاد ہے، اور وہ ہے اپنی ذات سے گزر جانا، اپنی ذات کو بھلا دینا، ''انانیت'' کی اسیری سے آزاد ہو جانا اور ''انا'' کو ترک کر دینا۔

اجتماعی مسائل میں عدل تمام اصولوں کی ماں ہے۔ عدالت، یعنی دوسروں کے حقوق کا لحاظ رکھنا، ان کی رعایت کرنا۔

وہ مشکل جس سے انسانیت اخلاقی مسائل میں بھی دوچار ہے اور اجتماعی مسائل میں بھی اس کا سامنا کر رہی ہے، وہ ان اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کا مسئلہ ہے۔ یعنی کوئی بھی شخص ایسا نہیں جو اخلاق سے ناواقف ہو، یا اس بات کا علم نہ رکھتا ہو کہ عدالت کس حد تک ضروری ہے۔ لیکن مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب ان اصولوں پر عمل کا مرحلہ آتا ہے۔

جس وقت انسان کسی اخلاقی اصول کی پابندی کرنا چاہتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ اس کے مفاد اور منفعت ایک طرف ہیں اور اخلاقی اصول کی پابندی دوسری طرف۔ وہ دیکھتا ہے کہ راست گوئی ایک طرف ہے اور منفعت اور فائدہ دوسری طرف۔ یا تو وہ جھوٹ بولے، خیانت کرے اور نفع حاصل کرلے، یا پھر سچ بولے، امانت داری کا ثبوت دے اور اپنے منافع کو پس پشت ڈال کر ظاہری نقصان اٹھالے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ عدل و انصاف اور اخلاق و کردار کا دم بھرنے والا انسان بھی مقام عمل میں عدل و اخلاق کی مخالف راہ اختیار کر لیتا ہے۔

ایمان کی تاثیر

ایمان ایسی طاقت ہے جو اخلاق اور عدل کی پشت پناہ اور ضامن ہے اور یہ چیز اگر انسان میں پیدا ہو جائے تو وہ با آسانی اخلاق اور عدل کے راستہ پر قدم بڑھا سکتا ہے اور اپنے نفع اور مفاد سے دستبردار ہو سکتا ہے۔

البتہ کون سا ایمان؟ جی ہاں، خود عدل اور اخلاق پر ایمان۔

انسان میں عدل و انصاف اور اخلاق و کردار پر ایک مقدس امر کے طور پر ایمان کب پیدا ہوتا ہے؟

یہ ایمان اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ تقدس کی بنیاد یعنی ''خدا'' پر ایمان رکھتا ہو۔ لہٰذا انسان مقام عمل میں اتنا ہی عدل کا پابند ہوتا ہے جتنا خدا کا معتقد ہوتا ہے، اتنا ہی اخلاق کا پابند ہوتا ہے جتنا خدا پر ایمان رکھتا ہے۔

ہمارے دور کی مشکل یہی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ''علم'' کافی ہے۔ یعنی با اخلاق اور عادل ہونے کے لئے ہمارا عدل اور اخلاق سے واقف ہونا اور ان کا علم رکھنا ہی کافی ہے۔ لیکن تجربہ نے بتایا ہے کہ اگر علم سے ایمان کا رشتہ ٹوٹا ہوا ہو، تو یہ عدل اور اخلاق کے لئے نہ صرف مفید نہیں، بلکہ مضر

ہے۔اور ''سنائی'' کے اس قول کا مصداق ہو جاتا ہے کہ: ''چو دزدی با چراغ آید گزیدہ تر برد کالا'' جب چور چراغ کے ہمراہ آتا ہے تو اچھی طرح چن چن کر مال لے جاتا ہے۔

لیکن اگر ایمان پیدا ہو جائے، تو اخلاق اور عدل میں استحکام آجاتا ہے۔مذہبی ایمان کے بغیر اخلاق اور عدل ایسے ہی ہے جیسے بغیر ضمانت کے کرنسی جاری کر دینا۔ جب مذہبی ایمان آجاتا ہے تو اخلاق اور عدل بھی آجاتے ہیں۔

ایسے مقام پر پہنچ کر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے خدا کی پرستش و عبادت کو اخلاق اور عدالت سے جدا ایک مستقل مسئلہ قرار نہیں دیا ہے۔یعنی جس عبادت کا اسلام حکم دیتا ہے اس کی چاشنی اخلاق اور عدل کو قرار دیتا ہے۔یا یہ کہیں کہ جس عدالت اور اخلاق کو تجویز کرتا ہے، اس کی چاشنی عبادت میں مانتا ہے کیونکہ اس کے بغیر یہ ممکن نہیں۔

ایک مثال عرض کرتا ہوں: آپ کو دنیا میں پائے جانے والے ادیان و مکاتب میں سے کسی مکتب اور دین میں یہ بات کہاں نظر آتی ہے کہ ایک مجرم خود اپنے قدموں سے چل کر آئے اور اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کرے؟ مجرم تو ہمیشہ سزا سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ واحد قدرت جو مجرم کو خود اپنے قدموں پر چلا کر اور اپنے ارادہ اور اختیار سے سزا کی طرف

اپنے خدا کی یاد سے زندہ تھا، وہ لمحہ، وہ نورانی لمحہ ہے۔ لیکن وہ لمحے جب تم غافل تھے، شہوات میں غرق تھے، تم نے خدا کی رضا کے برخلاف قدم اٹھایا تھا، وہ تمہاری عمر کے سیاہ اور تاریک اوقات ہیں۔ یہ تمہارا وقت ہے، تمہاری عمر ہے۔

ذکر خدا روح عبادت

یاد خدا، روح عبادت ہے۔ عبادت کی روح یہ ہے کہ جب انسان عبادت کر رہا ہو، نماز پڑھ رہا ہو، دعا کر رہا ہو الغرض کوئی بھی عمل انجام دے رہا ہوں، تو اس کا دل اپنے خدا کی یاد میں زندہ ہو: ''واقم لصلوٰۃَ لِذکری'' (۱)

قرآن کہتا ہے نماز قائم کرو۔ کس لئے؟ اس لئے کہ میری یاد میں رہو۔ ایک دوسری جگہ قرآن کریم فرماتا ہے:

''ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشا والمنکر ولذکر اللہ اکبر'' (۲)

---

(۱) ''اور میری یاد کے لئے نماز قائم کرو۔'' (سورہ طہ ۱۴)

(۲) ''نماز ہر برائی اور بدکاری سے روکنے والی ہے، اور اللہ کا ذکر بہت بڑی شے ہے۔'' (سورہ عنکبوت ۴۵)

لاتی ہے وہ ''ایمان'' کی طاقت ہے، اس کے سوا کوئی اور چیز ایسا نہیں کر سکتی۔

جب ہم اسلام کے ابتدائی دور پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں بکثرت ایسی مثالیں نظر آتی ہیں۔ البتہ ابتدائی دور کے ذکر سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ اس ابتدائی دور کے سوا کسی اور دور میں ایسی مثالیں نہیں ملتیں۔ نہیں، صدر اسلام کے علاوہ دوسرے زمانوں میں بھی، لوگوں میں پائے جانے والے ایمان کے تناسب سے ایسی مثالیں موجود ہیں۔

اسلام نے مجرم کے لئے سزا کا تعین کیا ہے۔ مثلاً شراب خوار، زنا کار اور چور کے لئے سزائیں معین کی ہیں۔ دوسری طرف اسلام میں ایک اصول ہے اور وہ یہ کہ ''الحدود تدرء بالشبهات'' یعنی حدود معمولی شبہ پر دفع ہو جاتی ہیں۔ اسلام قاضی اور حاکم کو اس بات کا پابند نہیں کرتا کہ وہ مجرم کو تلاش کرنے کے لئے جاسوسی کریں، تجسس کریں۔ بلکہ مجرم کے دل میں ایک طاقت ڈالتا ہے جس کے اثر سے وہ خود اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کرتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے دور میں کثرت کے ساتھ ایسا ہوا کرتا تھا کہ لوگ خود پیغمبرؐ یا امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور عرض کرتے تھے کہ یا رسول اللہؐ یا امیر المومنینؑ ہم فلاں جرم کے مرتکب ہوئے ہیں، ہمیں

سزا دیجئے۔ ہم آلودہ ہیں، ہمیں پاک کر دیجئے۔

ایک شخص رسول اکرمؐ کی خدمت میں آیا اور کہا: اے اللہ کے رسولؐ! میں نے زنا کیا ہے، مجھے سزا دیجئے۔ کیونکہ اس قسم کے مسائل میں ایسے شخص کے لئے چار مرتبہ اقرار کرنا ضروری ہے، ایک مرتبہ اقرار کافی نہیں ہے، لہٰذا پیغمبر نے فرمایا: "لعلك قبلت" شاید تم نے اس عورت کا صرف بوسہ لیا ہوگا اور کہہ رہے ہو کہ میں نے زنا کیا ہے یعنی آنحضرت اس کے منہ میں الفاظ رکھ رہے ہیں۔ اگر وہ کہے کہ ہاں میں نے بوسہ لیا ہے اور میری نظر میں چومنا بھی زنا کی مانند ہے، معاملہ یہیں پر ختم ہو جاتا۔ اس نے کہا: نہیں، اے اللہ کے رسولؐ! میں نے زنا کیا ہے۔ فرمایا: "لعلك غمزت" شاید تو نے برائی کا صرف ارادہ کیا ہوگا، یا اس کے جسم کو گدگدایا ہوگا۔ شاید وہ کہے ہاں، ایسا ہی تھا، اس سے زیادہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ اس نے کہا: نہیں، اے اللہ کے رسولؐ! میں زنا کا مرتکب ہوا ہوں۔ آپ نے فرمایا: شاید تو زنا کے قریب پہنچ گیا ہو اور در حقیقت زنا انجام نہ پایا ہو؟ اس نے کہا: نہیں، اے اللہ کے رسول! میں آلودہ ہوا ہوں، میں ناپاک ہوا ہوں۔ میں اس لئے آیا ہوں کہ آپ مجھ پر حد جاری فرمائیں اور اسی دنیا میں مجھے سزا دیں، میں نہیں چاہتا کہ میرا یہ جرم دوسری دنیا میں میرے ساتھ جائے۔

اب جو روایت پیش کرنے جا رہا ہوں یہ ''کافی'' میں ہے۔

(فروع کافی، ج ۷، ص ۵۶۱)

ایک عورت امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے عرض کی: اے امیر المومنین! میں نے زنائے محصنہ کیا ہے، میں شادی شدہ ہوں، شوہر کی غیر موجودگی میں زنا کی مرتکب ہوئی ہوں اور اس کے نتیجہ میں حاملہ ہوگئی ہوں۔ ''طہرنی'' مجھے پاک کر دیجئے، میں آلودہ ہوں۔ امام نے فرمایا: ایک مرتبہ کا اقرار کافی نہیں، چار مرتبہ اقرار کرنا ضروری ہے۔(۱) پھر یہ کہ اگر ایک شادی شدہ عورت زنا کی مرتکب ہو تو اسے ''رجم'' یعنی سنگسار کیا جانا چاہئے۔ میں اگر تمہیں سنگسار کرنے کا حکم دوں گا تو اس بچہ کا کیا ہوگا جو تمہارے شکم میں ہے؟ اس کو تو ہم سنگسار نہیں کر سکتے۔ تم جاؤ بچہ کی پیدائش کے بعد آنا، اس وقت ہم اس کی وجہ سے تمہیں سنگسار نہیں کر سکتے۔ یہ سن کر وہ عورت چلی گئی۔

چند مہینوں کے بعد پھر واپس آتی ہے، ایک بچہ اس کی گود میں ہے۔

کہتی ہے:

---

(۱) ''اسلام میں کسی صورت میں بھی حتی قاضی تک کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ تجسس کرے یا بہانہ سے اقرار لے بلکہ جب کوئی انسان اقرار کرتا ہے تو قاضی ایک بہانہ کے ذریعہ اس کے اقرار کو مسترد کرتا ہے۔''

"یا امیر المومنینؑ اطھرنی"

"اے امیر المومنین ! مجھے پاک کر دیجئے۔"

بولی، میرا عذر یہ بچہ تھا، اب یہ دنیا میں آچکا ہے یہ دوسرا اقرار تھا۔ امیر المومنین نے فرمایا: اب اس موقع پر اگر ہم تجھے سنگسار کر دیں تو اس بچہ کا کیا قصور ہے؟ ابھی اسے ماں کی ضرورت ہے، اسے ماں کا دودھ چاہئے، یہ ماں کی دیکھ بھال اور نگہداشت کا طالب ہے۔ فی الحال جاؤ، ابھی اس ابھی اس کو تمہاری ضرورت ہے۔ وہ دل شکستہ ورنجیدہ حالت میں لوٹ گئی۔

ایک دو سال بعد دوبارہ آئی، بچہ بھی اس کے ساتھ تھا اور آکر کہنے لگی:

"یا امیر المومنینؑ اطھرنی"

اب میرا بچہ دودھ نہیں پیتا، اسے دودھ پلانے والی کی ضرورت نہیں رہی، اب وہ بڑا ہو گیا ہے۔ اب مجھے پاک کر دیجئے۔ فرمایا: نہیں، ابھی اس بچہ کو ماں کی ضرورت ہے۔ ابھی جاؤ۔ یہ سن کر اس عورت نے بچہ کا ہاتھ پکڑا، اب وہ روتی جاتی تھی اور یہ کہتی جاتی تھی کہ: خدایا! یہ تیسری مرتبہ ہے کہ میں گناہ کی اس آلودگی سے پاک ہونے کی غرض سے تیرے مقرر کردہ امام کی خدمت میں آئی ہوں، خلیفۂ مسلمین کے پاس آئی ہوں اور وہ ہیں کہ ہر مرتبہ کسی نہ کسی وجہ سے مجھے واپس لوٹا دیتے ہیں۔ بار الہا! میں اس گندگی

سے چھٹکارا چاہتی ہوں، میں آئی ہوں کہ وہ مجھے سنگسار کریں اور میں پاک ہو جاں۔ وہ یہ کہتی جا رہی تھی کہ اتفاقاً اس پر عمرو بن حریث کی نگاہ پڑ گئی، یہ ایک منافق انسان تھا۔ اس نے عورت سے پوچھا: کیا ہوا؟ کیا معاملہ ہے؟ اس نے اسے پورا قصہ سنایا۔ عمرو بن حریث نے کہا: آ میرے ساتھ، میں تمہارا مسئلہ حل کرتا ہوں۔ تم ایسا کرو کہ بچہ میرے حوالے کردو، میں اس کی کفالت کرتا ہوں۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ علی اس عورت سے چوتھی مرتبہ اقرار نہیں لینا چاہتے۔

امام دیکھتے ہیں کہ وہ عورت اپنے بچے اور عمرو بن حریث کے ساتھ واپس چلی آ رہی ہے۔ نزدیک آتی ہے اور کہتی ہے:

"یا امیر المومنین! اطهرنی"

"اے امیر المومنین! مجھے پاک کر دیجئے۔"

میں نے زنا کیا ہے، بچہ کا مسئلہ بھی حل ہو گیا ہے، اس شخص نے اسے پالنے کی ذمہ داری لے لی ہے، اب آپ مجھے پاک کر دیجئے.....

کہتے ہیں کہ امیر المومنین کو معاملہ کا یہاں تک پہنچنا بہت ناگوار گزرا۔

یہ ایمان اور مذہب کی طاقت ہے جو انسان کے ضمیر کی گہرائیوں میں اثر انداز ہو کر اسے عدالت اور اخلاق کے سامنے جھکا دیتی ہے۔ عبادت

اس لئے ہے تا کہ انسان کی ایمانی حیات کی تجدید ہو، اس کا ایمان تازہ ہو، اس میں طراوت اور نشاط پیدا ہو، وہ قوت اور طاقت حاصل کرے۔

جتنا انسان کا ایمان زیادہ ہوگا، اتنا ہی وہ خدا کو زیادہ یاد رکھے گا، اور جتنا خدا کو یاد رہے گا اتناہ ہی کم گناہ کا مرتکب ہوگا۔ گناہ اور نافرمانی کرنے یا نہ کرنے کا دارومدار علم پر نہیں ہے، اس کا دارومدار غفلت اور یاد پر ہے۔ جتنا انسان غافل ہوگا، یعنی اس نے جتنا خدا کو فراموش کر دیا ہوگا، اتنا ہی زیادہ گناہ کا ارتکاب کرے گا اور جتنا خدا کو یاد رکھے گا، اتنی ہی اس کی نافرمانیاں کم ہوں گی۔

عصمت اور ایمان

آپ جانتے ہیں کہ انبیاءؑ اور ائمہؑ، معصوم ہوتے ہیں۔ اگر آپ سے پوچھا جائے کہ انبیاءؑ اور ائمہؑ کے معصوم ہونے کے کیا معنی ہیں؟ تو آپ جواب دیں گے کہ وہ کسی بھی صورت میں گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔

ٹھیک ہے۔ عصمت کے معنی یہی ہیں۔ لیکن اگر اس کے بعد آپ سے سوال کیا جائے کہ یہ لوگ کیوں گناہ نہیں کرتے؟ تو ممکن ہے آپ اس سوال کا دو طرح سے جواب دیں۔ ایک یہ کہ انبیاءؑ اور ائمہؑ اس وجہ سے معصوم

ہیں اور گناہ نہیں کرتے کہ خداوند عالم ان کے اور گناہ کے درمیان رکاوٹ بنتا ہے، اس نے انہیں بالجبر گناہ اور معصیت سے روکتا ہے۔یعنی جب کبھی وہ گناہ کرنا چاہتے ہیں، خدا رکاوٹ کھڑی کر دیتا ہے اور ان کا راستہ روک دیتا ہے۔

اگر عصمت کے یہ معنی ہیں تو اس میں انبیاءؑ اور ائمہؑ کے لئے کوئی فضیلت و کمال نہیں۔ اگر میرے اور آپ کے ساتھ بھی اسی طرح ہونے لگے کہ جوں ہی ہم گناہ اور خدا کی نافرمانی کرنا چاہیں تو ایک طاقت ہمارے راستہ میں حائل ہو جائے اور ہمارے اور گناہ کے درمیان رکاوٹ بن جائے۔ایسی صورت میں بحالت مجبوری ہم بھی گناہ سے محفوظ رہیں گے۔

پس، ایسی صورت میں انبیاءؑ اور ائمہؑ کو ہم پر کیا فضیلت ہوئی؟ اس صورت میں تو ان کے اور ہمارے درمیان صرف یہ فرق رہ جائے گا کہ وہ خدا کے ایسے بندے ہیں جنہیں اس نے خاص امتیاز سے نوازا ہے، جب وہ خدا کی نافرمانی کرنا چاہتے ہیں تو خدا ان کے راستہ میں حائل ہو جاتا ہے لیکن ہمیں یہ امتیاز حاصل نہیں، جب ہم نافرمانی کا ارادہ کرتے ہیں، تو خدا ہمارا راستہ نہیں روکتا۔

نہیں ایسا نہیں ہے، یہ خیال ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں۔

انبیاءؑ اور ائمہؑ کے معصوم ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ گناہ کرنا

چاہتے ہیں اور خدا ان کے اور گناہ کے درمیان رکاوٹ بن جاتا ہے۔

پھر حقیقت کیا ہے؟

عصمت کے معنی، ایمان کے اعلی ترین درجہ پر فائز ہونا ہے۔ جتنا ایمان زیادہ ہوگا اتنا ہی انسان کو خدا زیادہ یاد رہے گا۔ مثلا ایک بے ایمان شخص کا پورا دن، پورا ہفتہ اور پورا مہینہ گزر جاتا ہے مگر جو ذات اس کے ذہن میں ایک لمحہ کو بھی نہیں آتی، وہ خدا ہے۔ ایسا شخص تو بہت بڑا غافل ہے۔

بعض لوگوں کو کبھی کبھی خدا یاد آجاتا ہے۔ اس موقع پر انہیں خیال آتا ہے کہ ہمارا ایک خدا ہے، خدا ہمارے سروں پر ہے اور وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ لیکن ایک لمحہ کے لئے، اس کے بعد وہ اسے ایسے بھلا بیٹھتے ہیں جیسے کسی خدا کا وجود ہی نہیں۔

لیکن کچھ افراد جن کا ایمان مذکورہ بالا لوگوں سے کچھ زیادہ ہوتا ہے، کبھی غفلت میں ہوتے ہیں، کبھی بیدار۔ جب غافل ہوتے ہیں تو وہ گناہ کر بیٹھتے ہیں لیکن جب بیدار ہوتے ہیں تو اس بیداری کے نتیجہ میں وہ گناہ نہیں کرتے۔ کیونکہ جب وہ خدا کی جانب متوجہ ہوتے ہیں تو ان سے گناہ انجام پانے کا امکان ختم ہو جاتا ہے:

"لایزنی الزانی وھو مومن"

''کوئی شخص مومن ہوتے ہوئے زنا نہیں کر سکتا۔''

(وسائل الشیعہ، ج ۱، ص ۴۲، ح ۴۱)

جب انسان کی روح میں سچا ایمان موجود ہو اور وہ بیدار ہو تو گناہ میں مبتلا نہیں ہوتا۔ اب اگر انسان کا ایمان کمال کی حدوں کو چھولے، یہاں تک کہ وہ خدا کو ہمیشہ حاضر و ناظر سمجھنے لگے۔ یعنی خدا ہمیشہ اس کے دل میں موجود ہو، تو اس صورت میں وہ کبھی بھی غافل نہیں ہوتا، ہر عمل کی انجام دہی کے دوران خدا کی یاد اس کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے:

''رِجالٌ لاتُلهِيهِم تِجارةٌ ولابيعٌ عن ذِكرِ اللهِ''

''ایسے لوگ جنہیں کاروبار یا خرید و فروخت، ذکر خدا سے غافل نہیں کر سکتی۔'' (سورۂ نور ۳۷)

قرآن یہ نہیں کہتا کہ وہ لوگ جو تجارت نہیں کرتے۔ اسلام لوگوں کو تجارت اور کاروبار سے روکنے کے لئے نہیں آیا۔ یہ نہیں کہتا کہ تجارت نہ کرو۔ اس کے برعکس حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ محنت کرو، کماؤ، کاروبار کرو، تجارت کرو۔ وہ لوگ جو خرید و فروخت کرتے ہیں، تجارت کرتے ہیں، کماتے ہیں، ملازمت کرتے ہیں لیکن ان سب چیزوں کے باوجود ایک لمحہ کے لئے بھی خدا سے غافل نہیں ہوتے۔ دکان کے کاؤنٹر پر کھڑے ہوتے ہیں، چیزیں فروخت کرتے ہیں، تولتے ہیں، بولتے ہیں، پیسے لیتے ہیں اور

مال حوالہ کرتے ہیں لیکن جس چیز کو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی فراموش نہیں کرتے وہ "خدا" ہے۔ خدا ہمیشہ ان کے ذہنوں میں رہتا ہے۔

اگر کوئی ہمیشہ بیدار ہو، ہمیشہ خدا اس کے ذہن میں ہو، تو قدرتی بات ہے کہ وہ کبھی بھی گناہ کا مرتکب نہیں ہوگا۔ البتہ ہم ایسی دائمی بیداری معصومین علیہم السلام کے سوا کسی اور میں نہیں پاتے۔ چنانچہ معصومینؑ ہی وہ ذوات مقدسہ ہیں جو کسی بھی لمحہ خدا کو نہیں بھولتے۔

آپ کی خدمت میں ایک مثال عرض کرتا ہوں: کیا کبھی آپ کے ساتھ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ آپ نے جان بوجھ کر اپنا ہاتھ آگ میں ڈال دیا ہو، یا آگ میں کود پڑے ہوں؟ اگر آپ کو معلوم نہ ہو، بے خبری میں ایسا ہو گیا ہو تو دوسری بات ہے۔ پوری زندگی میں ایک بار بھی ایسا نہیں ہوتا کہ ہم میں سے کوئی جان بوجھ کر خود کو آگ میں جھونک دے۔ البتہ اگر ہم خودکشی کرنا چاہیں تو الگ بات ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ ایسا اس لئے ہے کہ ہم بخوبی یہ بات جانتے ہیں کہ آگ کا کام جلانا ہے، ہم جانتے ہیں کہ اگر آگ کے بھڑکتے شعلوں میں گر جائیں گے تو یقیناً زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ ہم قطعی اور یقینی طور پر اس بات کا علم رکھتے ہیں اور جوں ہی ہمیں آگ نظر آتی ہے یہ علم ہمارے ذہن میں حاضر ہو جاتا ہے اور ہم ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے غافل نہیں

اس آیت میں نماز کی خاصیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ البتہ وہ نماز جو حقیقی ہو، جو واقعی ہو، ایسی نماز ہو جو صحیح شرائط اور آداب کے ساتھ ادا کی گئی ہو۔ فرماتا ہے: اگر انسان حقیقتاً نماز پڑھنے والا ہو اور صحیح نماز پڑھے، تو خود نماز انسان کو نازیبا کاموں اور منکرات سے روکتی ہے۔ محال ہے کہ انسان درست اور مقبول نماز پڑھے اور جھوٹا ہو۔ محال ہے کہ انسان صحیح اور درست نماز پڑھے اور اس کا دل غیبت کرنے کو چاہے۔ محال ہے کہ انسان درست اور صحیح نماز پڑھنے والا ہو اور اس کی شرافت اسے شراب خانہ کی طرف جانے کی اجازت دے، وہ بے حیائی کی طرف جائے، کسی بھی دوسرے نازیبا کام کی طرف قدم اٹھائے۔ نماز کی خاصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو عالم نورانیت کی طرف لے جاتی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک روایت ہے، جو معروف کتاب ''مصباح الشریعہ'' میں نقل ہوئی ہے۔ ہمارے پاس ''مصباح الشریعہ'' نامی کتاب ہے، جسے بہت سے بزرگ علما معتبر سمجھتے ہیں، جب کہ بعض علماء، جیسے مرحوم علامہ مجلسی اس کتاب کو زیادہ معتبر نہیں سمجھتے، اس اعتبار سے کہ اس کے مضامین کچھ عرفانی مضامین پر مشتمل ہیں۔ البتہ یہ ایک معروف کتاب ہے۔ حاجی نوری، سید بن طاووس اور ان جیسے دوسرے حضرات نے اس کتاب سے مطالب نقل کیے ہیں۔ اس کتاب میں بکثرت احادیث ہیں۔

ہوتے۔ لہذا ہم اپنے آپ کو آگ میں جھونکنے سے معصوم ہیں۔ یعنی اس بات پر ہمیں حاصل یہ علم ویقین اور ایمان کہ آگ جلانے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اگر آگ میں کودے تو جل کر مر جائیں گے، ہمیں آگ میں کود پڑنے سے باز رکھتا ہے۔

جس طرح ہم آگ کے جلانے کی صلاحیت پر ایمان رکھتے ہیں، اسی طرح اولیائے خدا، گناہ کے جلانے کی صلاحیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ لہٰذا وہ معصوم ہوتے ہیں کسی گناہ کے قریب نہیں جاتے۔

اب جبکہ معصوم کے معنی معلوم ہو چکے ہیں، اس جملہ کا مقصد بھی واضح ہو گیا ہو گا کہ ''عبادت اسلام کی تربیتی نظام کا حصہ ہے۔'' عبادت اس لئے ہے کہ انسان کو تھوڑی دیر بعد خدا کی یاد دلایا جائے اور جتنا اسے یاد ہو گا اتنا ہی زیادہ وہ اخلاق، عدل اور حقوق کا پابند ہو گا۔ یہ ایک بالکل واضح بات ہے۔

دنیا بھی آخرت بھی

اب آپ اپنی پوری توجہ اس موضوع پر مرکوز فرمایئے کہ اسلام میں دنیا اور آخرت کس طرح ملی ہوئی ہیں۔ اسلام عیسائیت کی طرح نہیں ہے۔

عیسائیت میں دنیا اور آخرت کا حساب و کتاب الگ الگ ہے۔ عیسائیت کہتی ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کیا جا سکتا ہے، یا یہ، یا وہ۔ لیکن اسلام میں ایسا نہیں ہے۔ اسلام آخرت کو دنیا کے ساتھ اور دنیا کو آخرت کے ہمراہ قرار دیتا ہے۔ مثلاً نماز ہی کو لے لیجئے، اس کا خالص اخروی پہلو یہ ہے کہ انسان خدا کو یاد رکھے اور خوف خدا رکھے۔

ورنہ حضور قلب اور خدا کی جانب متوجہ ہونے کے لئے اتنے آداب کی کیا ضرورت ہے کہ انسان پہلے وضو کرے، خود کو پاک و صاف کرے، کیا خدا سے ملاقات کے لئے وضو اور پاکیزگی کوئی تاثیر رکھتی ہے؟ ظاہری طور پر دیکھیں تو خدا کے حضور جانے کے لحاظ سے اس بات کی کوئی تاثیر نہیں کہ انسان کا منہ دھلا ہوا ہے یا نہیں، لیکن خداوند عالم فرماتا ہے:

"اذا قمتم الی الصلاۃ فاغسِلوا وجوھکم و یدیکم الی المرافِقِ"(۱)

پھر اس کے بعد نماز پڑھو۔

دیکھا آپ نے اسلام نے صفائی کو عبادت کے ساتھ ملا دیا ہے:

---

(۱) ایمان والو جب بھی نماز کے لئے اٹھو تو پہلے اپنے چہروں کو اور کہنیوں تک اپنے ہاتھوں کو دھولو۔ (سورہ مائدہ ۶)

"وان کنتم جنبا فاطھروا" (۱)

یہاں عبادت کے ساتھ پاکیزگی کا ذکر ہے۔

اگر آپ نماز پڑھنا چاہتے ہیں تو جگہ مباح ہونا چاہئے، غصبی نہ ہو۔ وہ جانماز جس پر کھڑے ہوکر آپ نماز پڑھتے ہیں، وہ لباس جسے پہن کر آپ نماز ادا کرتے ہیں، اسے حلال اور مباح ہونا چاہئے۔ اگر آپ کے لباس کا ایک دھاگا بھی غصبی ہوا تو نماز باطل ہو جائے گی۔ اس مقام پر عبادت اور حقوق کے لحاظ کا امتزاج نظر آتا ہے۔ خدا کی عبادت کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ کہا جارہا ہے کہ لوگوں کے حقوق کا بھی احترام کیجئے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میں ایسی عبادت قبول نہیں کرتا جس میں دوسروں کے حقوق کا پاس ولحاظ نہ رکھا گیا ہو۔

لہٰذا جب کوئی شخص، نماز پڑھنا چاہتا ہے تو پہلے یہ دیکھتا ہے کہ یہ گھر جس میں وہ ہے اسے اس نے کسی سے ہتھیایا تو نہیں؟! جبراً تو اس پر قابض نہیں اگر ایسا ہے تو اس کی نماز باطل ہوگی۔ اب اگر وہ نماز پڑھنا چاہے تو مجبور ہوگا کہ پہلے غصبی گھر کو صاحب حق کے حوالہ کرے اور اپنے لئے ایک ایسے گھر کا بندوبست کرے جو اس کے لئے حلال ہو۔ یعنی اس کے اصل مالک

---

(۱) اور اگر جنابت کی حالت میں ہو تو غسل کرو۔ (سورہ مائدہ ۶)

سے خریدا ہوا ہو، وہ مالک اس کے وہاں رہنے پر راضی ہو۔ وہ جس فرش پر کھڑا ہے، اس کا مسئلہ بھی یہی ہے۔ اس کا لباس بھی ایسا ہی ہونا چاہئے، حتی اگر ناداروں کے حقوق، خمس یا زکات وغیرہ بھی اس کے ذمہ ہوں، تو انہیں بھی ادا کرے۔ اگر اس نے انہیں ادا نہیں کیا ہوگا، تو بھی اس کی نماز باطل ہوگی۔

اسی طرح اسلام ہم سے کہتا ہے کہ اگر نماز پڑھنا چاہتے ہو تو تم سب کو کعبہ کی طرف رخ کر کے کھڑے ہونا ہوگا۔ کعبہ کہاں ہے؟ وہ اولین عبادت گاہ جو دنیا میں خدا کی پرستش کے لئے بنائی گئی تھی، کہاں ہے؟

"ان اول بیت وضِع لِلناسِ للذِی بِبکة مبار کا" (۱)

تم سب پر اس پہلی مسجد کی سمت رخ کر کے کھڑا ہونا لازم ہے جسے خدا کے عظیم پیغمبر ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند اسماعیل علیہ السلام نے تعمیر کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہم کعبہ کی طرف رخ کر کے کیوں کھڑے ہوں؟ کیا بس وہیں خدا ہے؟ کیا خدا معاذ اللہ خانۂ کعبہ کے اندر ہے؟ قرآن مجید جو یہ کہتا ہے کہ:

---

(۱) بے شک سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا ہے وہ مکہ میں ہے، مبارک ہے۔ (سورہ آل عمران ۹۶)

"فاینما تولوا فثم وجه الله"(۱)

تم جس طرف بھی رخ کر کے کھڑے ہو جاؤ، وہیں خدا ہے، تم دائیں طرف رخ کرو یا بائیں طرف، خدا کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو۔ اوپر رخ کرو یا نیچے، خدا کی طرف تمہارا رخ ہوگا۔ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: اگر تمہیں رسی سے باندھ کر زمین کے نیچے ساتویں طبقہ تک بھی لے جائیں تب بھی خدا ہی کی طرف جاؤ گے۔ مشرق کی طرف جاؤ، تب بھی خدا کی طرف جاؤ گے، مغرب کی طرف جاؤ، تب بھی خدا کی طرف جاؤ گے، یہاں جو بیٹھے ہوئے ہو، یہاں بھی خدا کے ساتھ ہو۔ خدا کی کوئی خاص سمت نہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر ایسا ہے تو پھر ہم کعبہ کی طرف رخ کر کے کیوں کھڑے ہوں؟

اسلام کہتا ہے کہ عبادت کی انجام دہی کے دوران ایک اجتماعی تعلیم و تربیت بھی حاصل کیجئے۔ آپ سب کو ایک نقطہ واحد کی طرف رخ کر کے کھڑے ہونا چاہئے، اگر ایسا نہ ہو تو ایک شخص ایک طرف رخ کئے کھڑا ہوگا اور دوسرا دوسری طرف اور یہ تفرقہ اور انتشار کی علامت ہے۔ لیکن اگر تمام

---

(۱) درحقیقت تم جس طرف بھی رخ کرلوگے سمجھو وہیں خدا موجود ہے۔ (سورۂ بقرہ: ۱۱۵)

لوگ ایک نقطہ کی جانب رخ کر کے کھڑے ہوں، تو اس کا مطلب ہے کہ سب یکسو ہیں۔

تمام مسلمانوں کی ایک ہی سمت اور جہت ہونا چاہئے، اس مقصد کے لئے کس نقطہ کا انتخاب کریں جس میں شرک کی بو بھی نہ پائی جاتی ہو؟ اسلام کہتا ہے کہ اس کا انتخاب کرو جس کی طرف رخ کر کے کھڑے ہونا، تمہاری جانب سے عبادت کا احترام کہلائے، اس سمت رخ کر کے کھڑے ہو جو اولین عبادت گاہ ہے، عبادت گاہ کا احترام، عبادت کا احترام ہے۔

پھر اسلام کہتا ہے کہ اگر عبادت کرنا چاہتے ہو تو اس کا ایک معین اور خاص وقت ہے، اس میں سیکنڈوں کا بھی خیال رکھا جانا چاہئے۔ صبح کی نماز طلوع صبح کے آغاز سے لے کر طلوع آفتاب کی ابتدا تک ہے۔ اگر تم نے جان بوجھ کر صبح طلوع ہونے سے ایک سیکنڈ پہلے یا سورج طلوع ہونے کے بعد نماز شروع کی تو تمہاری نماز باطل ہوگی۔ نماز کو ان دو اوقات کے درمیان ہونا چاہئے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ کہیں کہ مجھے نیند آرہی ہے، رات بھر کا جاگا ہوا ہوں، گو ابھی صبح طلوع ہونے میں ایک گھنٹہ باقی ہے، یوں بھی خدا کو تو نہ نیند آتی ہے اور نہ ہی بیداری کا اس سے کوئی تعلق ہے، کیا خدا طلوعین کے درمیان (معاذ اللہ) اپنا مخصوص لباس پہن کر نماز قبول کرنے کے لئے تیار ہو کر بیٹھتا ہے؟...... خدا کے لئے تو تمام ساعات اور تمام لمحات مساوی

ہیں:

"لاتخذہ سِنۃ ولانوم"(۱)

لہٰذا کوئی یہ سوچ کہ میں نے رات جاگ کر گزاری ہے، بہت نیند آرہی ہے، کیوں نہ آدھا گھنٹہ پہلے ہی نماز پڑھ لوں اور پھر آرام سے سوجاؤں۔

نہیں جناب، وقت کی پابندی ضروری ہے۔ اپنے مقررہ وقت کے علاوہ کسی دوسرے وقت میں نماز نہیں پڑھی جاسکتی۔

کیا خدا کی نظر میں اس وقت اور دوسرے وقت کے درمیان کوئی فرق ہے؟

نہیں، خدا کے لئے کوئی فرق نہیں۔ ہاں آپ کے لئے ضرور فرق ہے۔ نماز کے ذریعہ آپ کی تربیت مقصود ہے، اگر آپ رات کو دو بجے تک بھی بیدار رہے ہیں، تب بھی آپ کو طلوعین کے درمیان اٹھ کر نماز ادا کرنا چاہئے۔ یہی حال ظہر اور عصر کی نمازوں کا بھی ہے، یہ بھی قبل از وقت قبول نہیں، وقت گزرنے کے بعد بھی قبول نہیں۔ مغرب اور عشا کی نمازوں میں بھی ایسا ہی ہے۔

---

(۱) اسے نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ۔ (سورہ بقرہ: ۲۵۵)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ نماز تو عبادت ہے، خداپرستی ہے، بھلا خدا پرستی کو ان معاملات سے کیا سروکار؟

نہیں جناب، اسلام میں خدا پرستی ان مسائل سے مربوط ہے۔ اسلام عبادت و پرستش اور دوسرے مسائل کے درمیان تفریق کا قائل نہیں۔

ممکن ہے کوئی کہے کہ میں نماز پڑھتا ہوں، لیکن نماز کے دروان گریہ بھی کرنا چاہتا ہو۔ میں مصیبت میں مبتلا ہوں، پریشانی کا شکار ہوں، چاہتا ہوں کہ نماز کے درمیان کچھ آنسو بہالوں۔ یا کوئی میرے ذہن میں آجائے، کوئی چیز دیکھوں یا تصور کروں اور پھر ہنسوں۔ اگر ایسا کروں تو کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے۔

نہیں جناب آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ نماز احساسات کو ضبط کرنے کا مظہر ہے، حالت نماز میں جب آپ ایک نقطہ کی سمت متوجہ ہوں تو اسی کی سمت متوجہ رہنا آپ پر فرض ہے۔ نہ دائیں، نہ بائیں حتی اپنا سر ادھر ادھر گھمانے کا بھی حق نہیں، چوکس حالت میں کھڑا ہونا چاہیے۔

کیا نماز میں ہنسا اور رویا جا سکتا ہے؟

نماز کے دوران کھانے پینے کا حکم کیا ہے؟

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی چیز روح عبادت سے متضاد نہیں۔ خدا کو یاد کر رہے ہیں ساتھ ساتھ ہنسی بھی آرہی ہے، ہنسا

چاہتے ہیں۔ رونا آرہا ہے، رونا چاہتے ہیں۔ یا دوران نماز کوئی چیز کھانا چاہتے ہیں۔

نہیں جناب، آپ کو اس تھوڑی سی مدت کے لئے مشق کرنا چاہئے تا کہ اس دوران آپ کو اپنے پیٹ پر کنٹرول ہو، اپنی ہنسی پر کنٹرول ہو، اپنے رونے پر کنٹرول ہو، اپنی بے نظمی پر کنٹرول ہو۔ یہ تمام چیزیں اجتماعی مسائل میں سے ہیں، لیکن اس وقت انہیں روکے رکھنا عبادت ہے۔ کیونکہ اسلام میں عبادت، تربیتی نظام کا ایک حصہ ہے، اس اصول کی رعایت کئے بغیر عبادت قبول نہیں۔

کیا اطمینان کے ساتھ جم کے کھڑے ہونا چاہئے؟

یہ بھی عجیب وغریب بات ہے جو بعض افراد سے سننے میں آئی ہے کہ میں نماز کی حالت میں حمد اور سورہ کی تلاوت کرتے ہوئے اس کی تمام شرائط کو ملحوظ رکھتا ہوں لیکن اگر اپنے جسم کو حرکت دوں، ایک پیر اٹھا کر دوسرے پر رکھ لوں، اپنے کو دائیں بائیں جنبش دوں، تو کہا جاتا ہے کہ تمہاری نماز باطل ہے۔ رکوع یا سجود میں بھی اگر اپنے آپ کو ہلاؤں، اپنے پیروں یا ہاتھوں کو حرکت دوں، تو کہتے ہیں کہ نماز باطل ہوگئی ہے۔ (کہتے ہیں) آرام وسکون کے ساتھ نماز پڑھو۔ یعنی جب کھڑے ہو اور اللہ اکبر کہنا چاہو تو جب تک تمہارا بدن ٹھہرا نہ ہو اس وقت تک اللہ اکبر نہ کہو۔ اگر ہلتے

ہوئے اللہ اکبر کہا تو نماز باطل ہوگی۔ پہلے سکون سے کھڑے ہو، پھر اللہ اکبر کہو۔ اس کے بعد اگر ہلنا ہو تو ہلو لیکن ہلتے وقت کوئی حرف زبان سے ادا نہ کرو، کوئی ذکر نہ پڑھو اگر بالفرض تمہارے پیر میں درد ہو، یا کسی اور عضو میں تکلیف ہو تو خاموش ہو جاؤ، پرسکون ہو جاؤ ذکر روک دو، جب ٹھہر جاؤ تو پھر ذکر شروع کرو:

"بِسمِ اِللهِ الرحمنِ الرحِیم

الحمدلِلهِ ربِ العلمِین"

نماز سکون اور اطمینان کے ساتھ ہونا چاہئے۔ اس دوران تمہاری روح بھی پرسکون ہو اور تمہارا جسم بھی۔

نماز، بندگان خدا سے صلح و آشتی کا اعلان ہے

نماز خدا کی جانب توجہ کا نام ہے۔ غیر خدا کی جانب توجہ شرک ہے۔

لیکن اس کے باوجود ہم سے کہا گیا ہے کہ نماز میں کہو:

"السلام علینا وعلی عباد الله الصالحین"

"ہم پر اور اللہ کے تمام نیک بندوں پر ہمارا سلام ہو۔"

اس طرح ہم خدا کے تمام صالح اور نیک بندوں سے یکجہتی، اتفاق اور صلح و آشتی کا اعلان کرتے ہیں۔ تمام اچھے لوگوں کے ساتھ مل جل کر باہمی محبت اور سلامتی کے ساتھ رہنے کا اعلان کرتے ہیں۔ حالت نماز میں کہتے

فضیل بن عیاض نام کا ایک شخص ہے، امام جعفر صادق علیہ السلام کا معاصر ہے، اس کا شمار معروف لوگوں میں ہوتا ہے، ایک ایسا شخص ہے جس نے اپنی عمر کا ایک حصہ گناہ، فسق و فجور، چوری، ڈاکا اور اسی قسم کے دوسرے مشاغل میں بسر کیا ہے۔ بعد میں اس میں ایک عجیب روحانی انقلاب پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنی بقیہ عمر (اپنی آدھی عمر) تقویٰ، زہد، عبادت اور معرفت و حقیقت کی تلاش میں بسر کرتا ہے۔ اس کی داستان معروف ہے۔ یہ ایک مشہور چور تھا، نقب زن تھا، خود اپنی داستان کچھ یوں بیان کرتا ہے۔ کہتا ہے: ایک رات میں نے ایک گھر کو نظر میں رکھا ہوا تھا، میں دیوار کے اوپر چڑھا، جب میں دیوار کے اوپر پہنچا اور چاہا کہ نیچے اتروں، تو ہمسایہ کے کسی گھر میں (یا اسی گھر کے اوپر) ایک عابد، زاہد اور متقی شخص، اپنی راتوں کو بیداری کے عالم میں بسر کرنے والا شخص قرآن پڑھنے میں مشغول تھا، بہت اچھے انداز اور انتہائی خوبصورت لحن کے ساتھ (۱) جب میں دیوار کے اوپر پہنچا تو اتفاقاً وہ قاری اور عابد شخص اس آیت کی تلاوت کر رہا تھا:

---

(۱) آپ جانتے ہیں کہ قرآن کو تجوید کے ساتھ پڑھنا (تجوید یعنی خوبصورت بنانا) یعنی حروف کو صحیح ادائیگی کے ساتھ پڑھنا، اچھے انداز میں پڑھنا، ایسا انداز جو اہل فسق کا لحن نہ ہو، ایک ایسے انداز سے پڑھنا جو قرآن سے تناسب رکھتا ہو قرآنی سنتوں میں سے ہے اور ہمارے ائمہ اطہار علیہم السلام خود اس میدان میں دوسروں سے آگے تھے۔ ہماری روایات

ہیں کہ ہم اللہ کے کسی بھی نیک بندے سے دشمنی اور عداوت نہیں رکھتے۔ کیونکہ اگر ہم کسی صالح اور نیک انسان سے دشمنی اور عداوت رکھتے ہوں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم خود صالح اور نیک نہیں۔

کچھ لوگوں کے خیال میں: "السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین" کہنے کا بھی عبادت کی روح سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں عبادت کی روح وجان تربیتی مسائل سے ممزوج ہوئے ہیں۔

نماز تقرب خدا کی سواری ہونے کے ساتھ ساتھ، تربیت کا مکتب و مدرسہ بھی ہے۔ معنوی اور روحانی مسائل کے لحاظ سے انسان جتنا اپنے آپ کو اور دوسروں کو فراموش کرے اتنا ہی بہتر ہے لیکن اجتماعی نقطۂ نظر سے دوسروں کو فراموش نہ کرنا لازمی اور ضروری ہے۔

سورۂ الحمد(۱) نماز کا لازمی جز ہے، اس میں ہم کہتے ہیں: "اِیاک نعبدو اِیاک نستعِین" یہ نہیں کہتے کہ "ایاک اعبد و ایاک استعین" "ایاک اعبد" متکلم واحد ہے اس کے معنی ہیں کہ خدایا! میں

---

(۱) ہر نماز میں سورۂ حمد پڑھنا ضروری ہے: "لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب" "بغیر سورۂ فاتحہ کے نماز درست نہیں۔" دوسرے سوروں میں کسی کا بھی انتخاب کیا جا سکتا ہے، لیکن سورۂ حمد پڑھنا لازم ہے۔

صرف تیری پرستش کرتا ہوں اور میں صرف تجھ سے مدد لیتا ہوں۔ لیکن ہم یہ نہیں کہتے، بلکہ کہتے ہیں: "اِیاکَ نَعبُدوَ اِیاکَ نَستَعِین" یعنی خدایا! ہم صرف تیری پرستش کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد واستعانت طلب کرتے ہیں۔ یعنی کہتے ہیں: خدایا! میں تنہا نہیں ہوں، دوسرے تمام مسلمان بھی میرے ساتھ ہیں۔

اس طرح انسان عبادت کی حالت میں اسلامی معاشرہ سے اپنی وابستگی اور پیوستگی کا اظہار کرتا ہے۔ کہتا ہے: خدایا میں ایک فرد نہیں ہوں، ایک نہیں ہوں، میں ایک پیکر کا عضو ہوں، میں ایک کل کا جز ہوں اور ایک بدن کا حصہ۔ "ہم" کہنا پڑے گا "میں" نہیں کہہ سکتے۔ تعلیمات اسلام میں "میں" اور انانیت ایک مذموم شے ہے۔ لہٰذا کہنا ہوگا کہ ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں، ہم صرف تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔

خدا کی کبریائی

نماز کے دوسرے حصے بھی اسی طرح ہیں، ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک درس ہے، تذکر اور یاد دہانی ہے۔

مثلاً آپ "اللہ اکبر" کے لفظ پر غور کیجئے۔

آخر وہ کونسا انسان ہے جو کسی عظیم شے کا سامنا ہونے پر اس سے مرعوب نہ ہو؟ انسان میں خوف پایا جاتا ہے..... جب وہ کسی پہاڑ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے یا اس کی چوٹی پر کھڑے ہو کر نیچے نگاہ ڈالتا ہے، تو اس پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ سمندر کی امنڈتی ہوئی موجیں دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ جب کسی صاحب قدرت وہیبت ہستی کو دیکھتا ہے، جب جاہ وحشم کی مالک کسی ہستی کا سامنا کرتا ہے، یا اس کے حضور جاتا ہے، تو ممکن ہے اس کے حواس باختہ ہو جائیں، اس کی زبان میں لکنت آ جائے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اس لئے کہ وہ اس کی عظمت وہیبت سے مرعوب ہو جاتا ہے۔ یہ انسان کیلئے ایک طبعی بات ہے۔

لیکن اللہ اکبر کہنے والا ایسا شخص جو اپنے آپ کو خدا کی کبریائی کی تلقین کرتا ہے، اسے کسی چیز یا کسی ہستی کی عظمت مرعوب نہیں کرتی۔ کیوں؟ کیونکہ "اللہ اکبر" یعنی ہر چیز سے بڑا بلکہ ہر توصیف سے بڑی ذات، ذات اقدس الٰہی ہے، یعنی اس بات کا اظہار کہ میں خدا کو عظیم سمجھتا ہوں، اور جب میں خدا کو عظیم سمجھتا ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میرے سامنے اس کائنات کی تمام اشیاء حقیر ہیں۔ اللہ اکبر کا لفظ انسان کو ایک شخصیت عطا کرتا ہے، انسان کی روح کو بزرگی اور بلندی عطا کرتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"عظم الخالق فی انفسھم فصغر ما دونہ فی اعینھم"

''خالق ان کی نگاہ میں اس قدر عظیم ہے کہ ساری دنیا ان کی نگاہوں سے گرگئی ہے۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۱)

یعنی خدا اہل حق کی روح میں جلوہ افروز ہے لہٰذا ان کی نظر میں خدا کے سوا ہر چیز پست اور معمولی ہے۔

اس جملہ کی مختصری وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

چھوٹا اور بڑا ہونا ایک نسبی امر ہے۔ مثلاً آپ حضرات جو اس ہال میں تشریف فرما ہیں، اگر یہاں آنے سے پہلے، اس سے چھوٹے ہال میں تقریباً اس سے ایک تہائی چھوٹے ہال میں بیٹھے ہوئے ہوں، تو یہ ہال آپ کو بہت بڑا محسوس ہوگا، لیکن اگر اس کے برعکس، پہلے آپ ایک ایسے ہال میں بیٹھے ہوں جو اس ہال سے تین گنا بڑا ہو تو جب وہاں سے یہاں آئیں گے تو آپ کو یہ ہال بہت چھوٹا معلوم ہوگا۔

انسان جب کبھی مختلف چیزوں کی چھوٹائی اور بڑائی کا موازنہ کرتا ہے تو ان میں چھوٹی دکھائی دینے والی چیزوں کو چھوٹا اور بڑی نظر آنے والی چیزوں کو بڑا قرار دیتا ہے۔ لہٰذا ایسے افراد جو اپنے پروردگار کی عظمت و بزرگی سے آشنا ہیں اور اس کی عظمت کو محسوس کرتے ہیں، ان کی نظر میں خدا

کے سوا ہر چیز حقیر اور چھوٹی ہے، بڑی نہیں ہو سکتی۔ سعدی نے بوستان میں کیا خوب کہا ہے:

بر عارفان جز خدا ہیچ نیست
رہ عقل جز پیچ در پیچ نیست

سعدی کہتے ہیں: اہل عرفان، خدا کے سوا کسی چیز کی حیثیت کے قائل نہیں، وہ کہتے ہیں کہ کسی اور چیز کا سرے سے وجود ہی نہیں۔

"وحدت الوجود" کے ایک معنی یہی ہیں کہ جب عارف کے سامنے خدا کی عظمت اور بزرگی واضح ہو جاتی ہے تو وہ کسی بھی صورت میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے سوا کسی اور چیز کا بھی وجود ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر "وہ" وجود ہے تو "اس" کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ عدم ہے۔ سعدی نے بھی وجود کے یہی معنی بیان کیے ہیں۔ بعد میں کہتے ہیں:

توان گفتن این با حقایق شناس
ولی خردہ گیرند، اہل قیاس

حقیقت شناس لوگ جانتے ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، لیکن وہ لوگ جو اہل قیاس ہیں، وہ ان پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وحدت الوجود کس شے کا نام ہے؟

که پس آسمان وزمین چیستند
بنی آدم و دیو و دد کیستند

اگر خدا کے سوا کسی اور چیز کا وجود نہیں، تو پھر زمین کیا ہے؟ آسمان کیا ہے؟ بنی آدم کیا ہے؟ دیو اور دد کیا ہے؟

پسندیده پرسیدی ای هوشمند	که خورشید و دریا و کوه و فلک
همه هر چه هستند از آن کمترند	جو ابت بگویم درایت پسند
پری و آدمی زاد و دیو و ملک	که با هستیش نام هستی برند

میں جب یہ کہتا ہوں کہ خدا کے سوا کچھ اور نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آسمان وزمین، انسان اور فرشتہ کسی بھی شے کا وجود نہیں۔ تم کہتے ہو کہ میں دوسری اشیاء کے وجود کا منکر ہو گیا ہوں، نہیں، ایسا نہیں ہے بلکہ اس خدا کی عظمت کو جان لینے کے بعد میں اس کے سوا جس چیز کو بھی دیکھتا ہوں اسے ہستی مان لینے سے خود کو عاجز پاتا ہوں۔

که جای که دریاست من چیستم
گر او هست حقا که من نیستم

جب آپ ''اللہ اکبر'' کہتے ہیں تو اگر روح اور دل کی گہرائی سے کہیں گے تو خدا کی عظمت آپ کے سامنے مجسم ہو جائے گی۔ اگر آپ کے دل میں خدا کی عظمت و بزرگی جلوہ گر ہو جائے تو پھر آپ کی نظر میں کسی

اور کا عظیم و بزرگ ہونا محال ہوگا، محال ہے کہ آپ کسی اور سے خوف کھائیں، کسی اور کے سامنے خضوع و خشوع کا اظہار کریں۔

یہی وہ چیز ہے جس کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ خدا کی بزرگی انسان کو آزادی عطا کرتی ہے۔ اگر انسان خدا کی عظمت اور بزرگی کو جان لے، تو اس کا بندہ بن جاتا ہے اور خدا کی بندگی کا لازمہ خدا کے سوا ہر کسی سے آزادی ہے:

نشوی بندہ تا نگردی حر   نتوان کرد ظرف پر زا پر

چند گوئی کہ بندگی چہ بود   بندگی جز شکندگی نبود

خدا کی بندگی غیر خدا کی بندگی سے آزادی کے مترادف ہے۔ کیونکہ خدا کی عظمت اور بزرگی کے ادراک کا لازمہ غیر خدا کے حقیر اور اس کے بے قیمت ہونے کا ادراک ہے۔ اور جب انسان غیر خدا کو، خواہ وہ کوئی بھی ہو، حقیر اور معمولی سمجھنے لگے تو محال ہے کہ جان بوجھ کر کسی حقیر کی بندگی کرے۔ حقیر کی بندگی کو عظیم سمجھنا ایک غلطی ہے۔

نماز کے دوسرے اذکار جیسے "**سبحان اللہ، الحمد للہ، سبحان ربی العظیم وبحمدہ، سبحان ربی الاعلی وبحمدہ**" اور تشہد وغیرہ میں ایک رمز اور راز پوشیدہ ہے۔

ایک شخص نے حضرت علی علیہ السلام سے سوال کیا: ہم نماز کی ہر

رکعت میں دو مرتبہ سجدہ کیوں کرتے ہیں؟ جس طرح ایک مرتبہ رکوع کرتے ہیں اسی طرح ایک مرتبہ سجدہ کرلیں تو کیا حرج ہے؟

البتہ آپ جانتے ہیں کہ رکوع سے زیادہ سجدہ میں خضوع وخشوع اور عاجزی وانکساری کا اظہار پایا جاتا ہے۔ کیونکہ سجدہ میں انسان اپنے سب سے بلند مرتبہ عضو کو عبودیت اور بندگی کے اظہار کے طور پر پست ترین چیز یعنی خاک پر رکھتا ہے۔ اپنی پیشانی خاک پر رگڑتا ہے اور اس طرح اپنے پروردگار کے سامنے اپنے معمولی اور حقیر ہونے کا اظہار کرتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ انسان کا سر اس کے بدن کا سب سے بلند مرتبہ حصہ ہے جس میں انسان کا دماغ ہوتا ہے اور سر میں بھی سب سے بلند مرتبہ پیشانی ہے۔

اس شخص نے کہا: ہم نماز کی ہر رکعت میں دو مرتبہ سجدے کیوں کرتے ہیں؟

امیرالمومنین علیہ السلام نے اس کے جواب میں یہ آیت پڑھی:

”مِنها خلقناکم وفِیها نعِیدکم ومِنها نخرِجکم تارۃ اخری“

”اسی زمین سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی میں پلٹا دیں گے اور پھر دوبارہ اسی سے نکالیں گے۔ (سورۂ طٰہٰ ۵۵)

اور پھر فرمایا: پہلی مرتبہ سجدہ میں سر رکھ کر جب اوپر اٹھاتے ہیں تو اس

کا مطلب اس بات کا اظہار ہے کہ: "مِنها خلقنا کم" ہم سب خاک سے خلق ہوئے ہیں، ہمارے اس پورے پیکر کی بنیاد خاک ہے، ہم جو کچھ بھی ہیں، اس خاک سے وجود میں آئے ہیں۔ جب دوسری مرتبہ اپنا سر خاک پر رکھتے ہیں تو تمہارے ذہن میں یہ ہونا چاہئے کہ ایک دن ہمیں مر کر اسی خاک میں واپس جانا ہے۔ اور جب دوبارہ سر اٹھاتے ہو تو ہمارے ذہن میں ہونا چاہئے کہ ایک مرتبہ پھر اس سے اٹھائے جائیں گے۔

گھر والوں کی نماز کے تئیں ہماری ذمہ داریاں

ایک اور بات کا ذکر کر کے اپنے معروضات ختم کر دوں گا:

میرا بہت دل چاہتا ہے کہ نماز جو دین کا ستون ہے، ہم اس کی اہمیت کو جان لیں، سمجھ لیں۔ سب جانتے ہیں کہ ہم اپنے اہل خانہ کی نماز کے ذمہ دار ہیں۔ یعنی اپنے بیوی بچوں کی نماز کے ذمہ دار ہیں۔ ہم میں سے ہر فرد خود اپنی نماز کا بھی ذمہ دار ہے اور اپنے اہل خانہ کی نمازوں کا بھی، یعنی اپنے بیوی بچوں کی نمازوں کا بھی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کیا گیا ہے:

"وامر اھلك بِالصلاة واصطبِر عليها" (۱)

---

(۱) اور اپنے اہل کو نماز کا حکم دیں اور اس پر صبر کریں۔ (سورۂ طہ ۱۳۲)

اے پیغمبر! اپنے اہل خانہ کو نماز کی تاکید کیجئے اور خود بھی نماز کے بارے میں صابر رہئے۔ یہ حکم صرف پیغمبر سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہم سب اس بارے میں ذمہ دار ہیں۔

بچوں کو کس طرح نماز کا عادی بنائیں؟

اس سلسلہ میں بچوں کو بچپنے ہی سے نماز کی مشق کرانا چاہئے۔ شریعت کا حکم ہے کہ بچوں کو سات سال کی عمر سے نماز کی مشق کرائی جائے۔ ظاہر ہے کہ سات سال کا بچہ صحیح طور سے نماز نہیں پڑھ سکتا۔ البتہ وہ نماز کی حرکات وسکنات ادا کر سکتا ہے، اسی عمر سے نماز کا عادی ہو سکتا ہے۔ خواہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ یعنی جوں ہی بچہ پرائمری کلاسوں میں آئے تو اسے اسکول میں نماز سکھانا چاہئے۔ گھر میں بھی اسے نماز کی تعلیم دینا چاہئے۔ البتہ ایک بات کی طرف توجہ رہے، اور وہ یہ کہ بچہ کو زبردستی نماز نہ سکھائیں، اسے اس طرح نماز پر آمادہ نہ کرنے کو وہ جبر محسوس کرے اس لئے کہ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا، کوشش کیجئے کہ آپ کے بچے ابتدا ہی سے شوق اور رغبت کے ساتھ نماز پڑھیں۔ آپ ان کے اندر نماز سے لگاؤ پیدا کیجئے، جس طرح بھی ممکن ہو بچوں کے لئے مشق کے اسباب فراہم کیجئے تا کہ وہ ذوق وشوق سے نماز پڑھیں۔ اس سلسلہ میں ان کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کیجئے، انعام دیجئے، ان سے محبت کا اظہار کیجئے، یہاں تک کہ وہ سمجھنے لگیں کہ جب

"الم یان للذین آمنوا ان تخشع قلوبهم لِذِکرِ اللّٰہِ وما نزل مِن الحق" (۱)

ظاہر اًفضیل عرب تھا، معنی سمجھتا تھا۔ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ:

کیا وہ وقت نہیں آیا جب با ایمان لوگوں کے دل، ایمان کا دعوی کرنے والوں کے دل، خدا کی یاد کے لئے نرم ہو جائیں؟ کب تک قساوت قلبی رہے گی؟ کب تک غفلت و بے خبری رہے گی؟ کب تک نیند کی حالت طاری رہے گی؟ کب تک حرام خوری اور قمار بازی کے مرتکب رہیں گے؟ کب تک نافرمانی میں مصروف رہیں گے؟

میں ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام اور امام سجاد علیہ السلام، انتہائی خوبصورت آواز میں قرآن پڑھا کرتے تھے۔ جب گھر کے اندر سے آپ کے قرآن پڑھنے کی آواز بلند ہوتی، تو یہ آواز سن کر گلی سے گزرنے والوں کے قدم وہیں جم جاتے (اس زمانہ میں مدینہ میں سقے گھروں میں پانی پہنچایا کرتے تھے) کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سقے پانی کی مشکیں اٹھائے ہوئے، باوجود یہ کہ انہیں زحمت کے ساتھ اٹھائے ہوتے تھے، جب وہاں پہنچتے تو یہ بھاری بوجھ اٹھائے ہونے کے باوجود قرآن کی یہ دلنشین تلاوت سننے کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ عابد شخص اس قرآنی سنت کے مطابق آدھی رات کو قرآن کی تلاوت میں مشغول تھا اور اپنے کمرے میں خوش الحانی کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا۔ جب دیوار کے اوپر پہنچا تو اتفاق سے وہ قاری اور عابد شخص اس آیت کی تلاوت کر رہا تھا۔

(۱) "کیا صاحبان ایمان کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ ان کے دل ذکر خدا اور اس کی طرف سے نازل ہونے والے حق کے لئے نرم ہو جائیں۔" (سورہ حدید ۱۶)

وہ نماز پڑھتے ہیں تو آپ ان سے زیادہ محبت کرنے لگتے ہیں۔

مزید یہ کہ بچہ کو ایسے ماحول میں لے جایئے جس میں اس کے اندر نماز پڑھنے کا شوق پیدا ہو۔ تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اگر بچہ مسجد میں نہ جائے، معاشرہ میں نہ جائے اور لوگوں کو اجتماعی طور پر نماز پڑھتے نہ دیکھے تو اس میں نماز کا شوق پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ درحقیقت اجتماع میں حاضری انسان میں شوق پیدا کرتی ہے۔ بڑی عمر کا انسان بھی جب اپنے آپ کو عبادت گزار لوگوں کے مجمع میں پاتا ہے تو اس میں بھی عبادت کی روح بڑھتی ہے، بچہ تو پھر بچہ ہے جو بڑوں کی بنسبت زیادہ متاثر ہوتا ہے۔

افسوس کہ مساجد، عبادت گاہوں اور دینی محافل میں ہمارے کم جانے اور بچوں کے بہت کم حاضر ہونے اور دینی اجتماعات میں بچوں کی شرکت کی کمی کے باعث، ان میں ابتدا ہی سے عبادت کی جانب رغبت پیدا نہیں ہوتی۔ یہ رغبت پیدا کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔

اسلام اگر یہ کہتا ہے کہ اپنے بچوں کو نماز کی تلقین کرو، تو اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ آپ آقاؤں کے سے انداز میں انہیں حکم دیں، ڈرائیں، دھمکائیں، ان کے سر پر سوار ہو جائیں۔ نہیں، بلکہ ہر اس وسیلہ سے استفادہ کیجیے جس کے بارے میں آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے بچوں کو نماز کی جانب راغب کرنے اور انہیں اس کا شوق دلانے کے لئے مفید واقع ہوگا۔

ہمیں اپنے بچوں کو اپنے ساتھ مسجد لے جانا چاہئے، تا کہ وہ مساجد اور عبادت گاہوں سے آشنا ہوں۔ خود ہم لوگ جو اپنے بچپنے ہی سے مساجد اور عبادت گاہوں سے آشنا تھے، اب آج کے ان حالات میں کتنا مسجد جاتے ہیں؟ ہمارے بچے سات برس کی عمر سے اسکول جاتے ہیں، اسکول کے بعد کالج اور پھر یونیورسٹی لیکن اگر کبھی انہوں نے مسجد میں قدم نہ رکھا ہوتو ایسی صورت میں کیا وہ مسجد جائیں گے؟ جی نہیں! ظاہر ہے کہ یہ بچے مسجد سے دور رہیں گے۔ اس صورتحال میں کیا آپ یہ عذر پیش کر سکتے ہیں کہ مساجد کے حالات اچھے نہیں، یا مثلاً مذہبی اجتماعات میں خطیب حضرات نا مناسب باتیں کرتے ہیں اس لئے ہم اپنے بچوں کو ان جگہوں سے دور رکھتے ہیں۔ مسجدوں اور منبروں کی اصلاح بھی ہمارا فریضہ ہے۔ فریضہ کسی مقام پر ختم نہیں ہو جاتا۔ مساجد کی اصلاح بھی ہماری ہی ذمہ داری ہے۔

پس اس بات کو بھی فراموش نہ کیجئے گا کہ ہم پر خود نماز کی ادائیگی بھی فرض ہے اور اپنے اہل خانہ کو نماز کا عادی بنانا بھی ہمارا فریضہ ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ہم ان میں نماز کی جانب رغبت اور لگاؤ پیدا کریں، جس قدر ممکن ہو نماز پڑھنے کے فوائد اور خصوصیات اور نماز کے فلسفہ سے اپنے بچوں کو آگاہ کریں۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ جب بعض اہل جہنم کو عذاب دیا جا رہا ہو گا تو

ان سے پوچھا جائے گا۔"ما سلککم فِی سقر" "کس چیز نے تمہیں جہنم میں پہنچایا ہے۔" "قالوا لم نك مِن المصلِین . ولم نك نطعِم المِسكِین" "ہم نماز نہیں پڑھتے تھے، مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔" "وکنا نخوض مع الخائِضِین" "لغو چیزوں میں شامل رہتے تھے۔" (سورہ مدثر ۴۲ تا ۴۵)

جہاں کہیں بھی دین مخالف باتیں کی جاتی تھیں، وہاں جا کر انہیں سنتے تھے، یا خود ایسی باتیں کرتے تھے۔اور یہ اسی کا نتیجہ ہے۔

یہاں سے سمجھ لیجئے کہ اسلام میں نماز کو اس قدر اہمیت کیوں حاصل ہے؟ کیوں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نماز اس خیمہ کا ستون ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر نماز قائم ہو اور اسے بطور صحیح قائم کیا جائے تو ہر چیز ٹھیک ہو جائے گی۔

حضرت علی علیہ السلام نے اپنی آخری وصیت میں، جسے آپ نے بارہا سنا ہوگا اور جو اللہ اللہ سے شروع ہوتی ہے) یہ وصیت کرنے کے چند ہی لمحوں بعد آپ اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے (اسی وصیت میں آپ نے نماز کے بارے میں فرمایا:

"اللہ اللہ بالصلاۃ فانھا عمود دینکم"

''نماز کے بارے میں اللہ سے ڈرنا کیونکہ وہ تمہارے دین کا ستون ہے۔'' (نہج البلاغہ، مکتوب ۴۷)

روز عاشورا کے بارے میں آپ نے سنا ہوگا اور جانتے ہوں گے کہ زیادہ تر شہادتیں ظہر کی نماز کے بعد ہوئیں۔ یعنی ظہر کے وقت تک حضرت امام حسین علیہ السلام کے اکثر اصحاب، تمام بنی ہاشم اور خود امام حسین علیہ السلام جو سب سے آخر میں شہید ہوئے زندہ تھے۔ ظہر سے پہلے امام حسین کے فقط تین اصحاب دشمن کی طرف سے ہونے والی ایک تیراندازی میں شہید ہوئے تھے، ورنہ امام کے لشکر کے باقی دوسرے افراد ظہر کے وقت تک بقید حیات تھے۔

اصحاب امام حسینؑ میں سے ایک شخص کو خیال آیا کہ ظہر کی نماز کی ادائیگی کا اول وقت آپہنچا ہے۔ وہ امام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: یا اباعبداللہ! نماز کا وقت ہوا چاہتا ہے، ہمارا دل چاہتا ہے کہ آپ کی اقتدا میں آخری نماز جماعت ادا کریں، امام نے نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور نماز کے وقت کی آمد کی تصدیق کی۔ کہتے ہیں کہ فرمایا:

''ذکرت الصلوۃ یا ذکرت الصلوۃ'' اگر ''ذکرت'' کہا ہو تو معنی ہوں گے کہ تمہیں نماز یاد آئی، اور اگر ''ذکرت'' کہا ہو تو معنی کیے جائیں گے کہ تم نے نماز کو یاد رکھا ''ذکرت الصلوۃ جعلك اللہ من

المصلین'' ''تم نے نماز کو یاد کیا خدا تمہیں نماز گزاروں میں قرار دے۔''

تصور کیجئے کہ ایک ایسا شخص جو سر بکف ہے، اپنی جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہے، ایسے مجاہد کے بارے میں امام دعا فرما رہے ہیں کہ خدا تمہیں نماز گزاروں میں سے قرار دے۔ دیکھا آپ نے حقیقی نماز گزار کتنا عظیم مقام رکھتا ہے۔

فرمایا: ہاں، ہم نماز پڑھیں گے، اسی جگہ میدان جنگ میں نماز پڑھیں گے۔

اس موقع پر ایسی نماز پڑھی گئی جسے فقہ میں ''نماز خوف'' کہا جاتا ہے۔ نماز خوف، مسافر کی نماز کی مانند چار رکعت کے بجائے دو رکعت ہوتی ہے۔ یعنی انسان اگر اپنے وطن میں بھی ہو تو اسے دو رکعت ہی پڑھنا چاہئے۔ کیونکہ حالات سازگار نہیں لہٰذا یہاں مختصر نماز پڑھنا چاہئے، اس لئے کہ تمام افراد کے نماز میں مشغول ہو جانے کی وجہ سے دفاع کی صورتحال خراب ہو جائے گی۔ سپاہیوں کا فرض ہے کہ اس نماز کے دوران آدھے سپاہی دشمن کا مقابلہ کریں اور آدھے امام جماعت کی اقتدا میں نماز پڑھیں۔ امام جماعت ایک رکعت پڑھنے کے بعد ٹھہرتا ہے تاکہ مقتدی اپنی دوسری رکعت پڑھ لیں۔ اس کے بعد وہ جا کر اپنے دوسرے ساتھیوں کی جگہ لے لیتے ہیں۔ جب کہ امام اسی طرح بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر ان کا انتظار کرتا ہے۔

پھر دوسرے سپاہی آتے ہیں اور امام کی دوسری رکعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔

امام حسین علیہ السلام نے اسی طرح نماز خوف ادا کی۔ لیکن امام کو ایک خاص صورتحال درپیش تھی۔ کیونکہ آپ دشمن سے زیادہ فاصلہ پر نہیں تھے۔ لہذا آپ کی حفاظت کرنے والا گروہ آپ کے بالکل سامنے کھڑا ہوا تھا، جب کہ بے حیا اور بے شرم دشمن نے انہیں نماز تک سکون سے نہیں پڑھنے دی۔ آپ نماز میں مشغول تھے کہ دشمن نے تیر اندازی شروع کردی، آپ پر دو قسم کی تیر اندازی کی گئی، ان میں سے ایک زبان کی تیر اندازی تھی۔ دشمن کے ایک سپاہی نے چیخ کر کہا: حسین! نماز نہ پڑھو، تمہاری نماز کا کوئی فائدہ نہیں، تم اپنے زمانہ کے امام یعنی یزید کے باغی ہو، لہذا تمہاری نماز قبول نہ ہوگی (نعوذ باللہ) جب کہ دوسری تیر اندازی معمول کے مطابق کمانوں سے پھینکے جانے والے تیروں کی تھی۔ امام حسین علیہ السلام کے وہ ساتھی جنہوں نے اپنے آپ کو امام کی ڈھال بنایا رکھا تھا ان میں سے دو اصحاب تیر لگنے کی وجہ سے خاک پر گر پڑے۔ ایک سعید بن عبداللہ حنفی اس وقت گرے جب امام حسین علیہ السلام اپنی نماز تمام کر چکے تھے۔ وہ جانکنی کے عالم میں تھے کہ امام ان کے سرہانے پہنچے۔ انہوں نے امام کو اپنے سرہانے دیکھ کر ایک عجیب جملہ کہا، عرض کی: "یـــا ابـــا عبد

اللہ!اوفیت" "اے اباعبداللہ! کیا میں نے وفا کی؟" یعنی اس حال میں بھی ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ امام حسین علیہ السلام کا حق اس قدر بلند و بالا ہے کہ اس کی ادائیگی کے لئے ایسی گرانقدر فداکاری بھی شاید کافی نہ ہو۔

صحرائے کربلا میں ابو عبداللہ الحسین علیہ السلام نے اس انداز سے نماز ادا کی۔

اباعبداللہ نے تکبیر کہی، ذکر پڑھا، "سبحان اللہ" کہا، "بحول للہ وقوتہ اقوم واقعد" کہا، رکوع و سجود کیے۔ اس نماز کے دو تین گھنٹے بعد امام حسین کے لئے ایک دوسری نماز پیش آئی، دوسرا رکوع پیش آیا، دوسرے سجود پیش آئے۔ ایک دوسرے انداز سے آپ نے ذکر کیا۔ آپ کا رکوع اس وقت ہوا جب ایک تیر آپ کے مقدس سینے میں اترا اور آپ اسے اپنی پشت کی طرف سے نکالنے پر مجبور ہوئے۔

کیا آپ کو پتا ہے کہ اباعبداللہ کے سجود کی کیا صورت تھی؟ آپ پیشانی سجدہ میں نہیں رکھ پائے کیونکہ آپ بے بس ہو کر گھوڑے سے زمین پر گرے تھے، لہذا آپ نے اپنا داہنا رخسار کربلا کی گرم ریت پر رکھا۔

اس موقع پر اباعبداللہ کا ذکر تھا:

"بسم اللہ وباللہ وعلی ملة رسول اللہ، ولاحول ولا قوة الا باللہ العلی العظیم وصلی اللہ علی محمد و آلہ

الطاہرین"

بسمك العظيم الاعظم

خدایا! ہمیں عاقبت بخیر فرما، ہم سب کو اپنی عبادت، عبودیت اور بندگی کی توفیق عنایت فرما۔

خدایا ! ہمیں حقیقی نماز گزاروں میں قرار دے، ہم سب کی نیتوں کو خالص کر دے۔

ہمیں شیاطین، جن اور انس کے شر سے محفوظ فرما۔

خدایا ! ہم سب کے مرحومین کی مغفرت فرما۔

❀❀❀



"اگر آج ہمارے نوجوان طلبہ، ہمارے اساتذہ اور دیگر شعبہ ہائے زندگی
سے تعلق رکھنے والے افراد چاہتے ہیں کہ اسلامی افکار و تعلیمات
گہرائی کے ساتھ سمجھیں اور اپنے سوالات کے جواب تلاش کریں تو وہ
شہید مطہری کی کتابوں کا مطالعہ کریں" (قائد انقلاب اسلامی امام خامنہ ای)

مطہری فکری و ثقافتی مرکز

یہ خدا کی آواز ہے، اس کے مخاطب ہم تمام لوگ ہیں۔ خدا ہم سے بات کر رہا ہے۔ اے میرے بندے، اے مسلمان! وہ وقت کب آئے گا جب یاد خدا کے لئے تیرا دل نرم ہوگا، جب تو خدا کی یاد کے لئے خاضع اور خاشع ہو جائے گا؟

اس عابد شخص نے اس انداز سے اس آیت کو پڑھا کہ فضیل، جو دیوار پر چڑھا ہوا تھا، اسے یوں محسوس ہوا کہ خود خدا اپنے بندہ فضیل سے مخاطب ہے۔ وہ کہتا ہے: اے فضیل! تو کب تک چوری، ڈاکا، زنا اور لوٹ مار کرتا رہے گا؟

یہ آیت سن کر فضیل لرز گیا اور یکا یک پکار اٹھا: خدایا! بس اب وہ وقت آن پہنچا ہے۔ پھر وہ اسی وقت دیوار سے اتر آیا اور توبہ کی، سچی توبہ، ایسی توبہ جس نے اس شخص کو اول درجہ کا عابد و زاہد بنا دیا۔ اس حد تک کہ تمام لوگ اس کا احترام کرنے لگے۔

وہ ایسا شخص نہیں تھا جو ہارون الرشید کے دربار میں حاضری دے۔ ہارون الرشید کو فضیل بن عیاض سے ملاقات کی بڑی آرزو تھی، لیکن کہتے ہیں کہ فضیل کبھی ہارون کے دربار میں نہیں آتے تھے۔ ہارون کہتا ہے کہ اگر فضیل نہیں آتے، تو میں چلا جاتا ہوں۔ ایک مرتبہ وہ فضیل کے پاس گیا۔ وہ ہارون ہے، ایک صاحب اقتدار بادشاہ ہے، دنیا میں بہت کم بادشاہ ایسے

گزرے ہیں جن کی مملکت کی وسعت اس کی مملکت کے برابر ہو، وہ دنیا کے بہت بڑے سلاطین میں سے ایک ہے۔ ایک فاسق اور فاجر شخص ہے۔ ایک ایسا شخص ہے جو رات بھر شراب نوشی، رقص و سرور اور اسی قسم کی باتوں میں مشغول رہا کرتا ہے۔ وہ فضیل کے پاس آتا ہے۔ وہی فضیل اپنی گفتگو کے چند جملوں سے اسے منقلب کر دیتے ہیں۔ وہاں موجود تمام لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے دیکھا ہے کہ فضیل کے سامنے ہارون انتہائی چھوٹا دکھائی دے رہا تھا، اور اس کی آنکھوں سے آنسو برسات کی طرح جاری تھے۔ فضیل اسے وعظ و نصیحت کر رہے تھے، اس کے سامنے اس کے ایک ایک گناہ کو گنوا رہے تھے۔ فضیل بن عیاض اس قسم کے شخص تھے۔ وہ اس حالت میں، جو انہوں نے اس دور میں پیدا کی، تقویٰ اور معرفت کے اس درجہ پر پہنچ گئے، امام جعفر صادق علیہ السلام کے معاصر تھے اور انہوں نے امام موسیٰ ابن جعفر الکاظمؑ کا زمانہ بھی دیکھا تھا۔

کتاب ''مصباح الشریعہ'' ایک ایسی کتاب ہے کہ ان کا دعویٰ ہے کہ میں امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور امام سے چند مسائل کے بارے میں سوال کیا اور امام نے مجھے یہ جوابات دیئے۔ ظاہری بات ہے کہ جب اس قسم کا عارف، بامعرفت، متقی اور زاہد انسان امام کی خدمت میں حاضر ہوگا، تو یہ کسی ایسے ساربان کے آپ کی خدمت میں جانے سے

بہت مختلف ہوگا جو مثلاً شکیات نماز کا کوئی مسئلہ آپ سے پوچھنا چاہتا ہو۔ قدرتی طور پر اس کے سوالات ایک درجہ بلند تر ہوں گے اور امام کے جواب بھی دوسروں کو دیئے جانے والے جوابات سے ایک درجہ بلند سطح کے ہوں گے۔ قدرتی طور پر یہ کتاب ایک بلند درجہ کتاب ہے۔ مثلاً امام جعفر صادقؑ نے اس کتاب میں اسرار وضو بیان کئے ہیں، اسرار نماز بیان کئے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث

وہ جملہ جس سے ہم استدلال کر رہے ہیں، وہ اس کتاب میں ہے۔ اور آپ نے اس جملہ کو کم وبیش عرفانی کتب میں دیکھا ہوگا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فضیل سے فرمایا:

"یا فضیل! العبودیة جوهرة کنهها الربوبیة"

انتہائی عجیب جملہ ہے، اور ایک لحاظ سے ہلا دینے والا جملہ بھی ہے فضیل! کیا تم جانتے ہو کہ عبودیت کیا ہے؟ کیا جانتے ہو عبودیت کیسا گوہر ہے؟ عبودیت ایک ایسا گوہر ہے کہ اس کا ظاہر عبودیت ہے اور اس کی حقیقت اور باطن ربوبیت ہے۔

ممکن ہے آپ کہیں کہ اس سے کیا مراد ہے؟ کیا امام جعفر صادق علیہ

السلام یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ عبودیت کی ابتدا بندگی ہے اور اس کی انتہا خدائی؟ کیا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک بندہ، بندگی کے راستہ خدائی اور الوہیت تک پہنچ جاتا ہے؟ نہیں، ائمہ علیہم السلام کی تعبیروں میں کسی صورت میں بھی اس قسم کی کوئی تعبیر نہیں آسکتی۔ اہل عرفان دوسرے لوگوں پر طنز کرنے کے لئے، جو معانی نظر میں رکھتے ہیں، کچھ تعبیریں استعمال کرتے ہیں، تاکہ دوسرے لرز کر رہ جائیں، انہیں جھٹکا لگے، یہ ایک طرح سے لوگوں کو چھیڑنا ہوتا ہے۔ مثلاً مولانا روم یا شبستری کے یہاں اس قسم کی تعبیریں ملتی ہیں، شبستری کہتے ہیں:

مسلمان گر بدانستی کہ بت چیست　　بدانستی کہ دین در بت پرستی است

یہ انتہائی عجیب بات ہے۔ لیکن اس سے مراد وہ نہیں ہے جو اس کے الفاظ سے ظاہر ہو رہی ہے۔ یہ شعر ایک صحیح مراد کا حامل ہے۔ ایک مقام پر ان کے بقول انھوں نے زاہد نما افراد کو چھیڑا ہے۔ ایک معروف شعر ہے، جسے مولانا روم سے منسوب کیا جاتا ہے، مجھے نہیں معلوم یہ مثنوی میں ہے یا نہیں۔ کہتے ہیں:

از عبادت می توان اللہ شد　　نمی توان موسیٰ کلیم اللہ شد

انتہائی عجیب کلام ہے۔ کہتے ہیں کہ عبادت کے ذریعہ موسیٰ کلیم اللہ نہیں بنا جا سکتا لیکن عبادت کے ذریعہ اللہ بننا ممکن ہے! مراد کیا ہے؟ یہ

حدیث جس کا ہم آپ کے لئے ترجمہ کر رہے ہیں، اس کی روشنی میں اس شعر کے معنی بھی واضح ہو جائیں گے۔

دراصل ربوبیت کے معنی ہیں تسلط، البتہ خدائی یا الوہیت نہیں۔ خدائی اور خداوندگاری کے درمیان فرق ہے۔ خداوندگاری، یعنی مالک ہونا، صاحب اختیار ہونا۔ اصحاب فیل کے قصہ میں جب ابرہہ کعبہ کو مسمار کرنے کی غرض سے آیا، تو وہاں بیابان میں موجود حضرت عبدالمطلب کے اونٹوں کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ عبدالمطلب ابرہہ کے پاس گئے۔ حضرت عبدالمطلب کی ہیبت، شخصیت اور عظمت نے ابرہہ کو انتہائی متاثر کیا، یہاں تک کہ وہ سوچنے لگا کہ اگر اس بزرگ نے سفارش کی اور مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں کعبہ کے خلاف اقدام نہ کروں، اور اسے نہ گراؤں، تو میں اسے مسمار نہیں کروں گا۔ لیکن اس کی توقع کے برخلاف جب حضرت عبدالمطلب نے فقط اپنے اونٹوں کے بارے میں گفتگو کی، کعبہ کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ ابرہہ کو تعجب ہوا، وہ بولا: میں تو آپ کو انتہائی بزرگ انسان سمجھتا تھا، میرا خیال تھا کہ آپ کعبہ کی سفارش کرنے کے لئے آئے ہیں۔ لیکن آپ تو اپنے اونٹوں کی سفارش کر رہے ہیں۔ حضرت عبدالمطلب نے بھی اسے ایک خوبصورت جواب دیا۔ فرمایا:

"انا رب الابل وللبیت رب"

”میں اونٹوں کا مالک ہوں اور اس گھر کا بھی ایک مالک ہے۔“

”رب“ یعنی مالک۔ ہم جو خدا کو رب کہتے ہیں، تو اس عنوان سے کہ وہ تمام عالموں کا مالک حقیقی ہے۔ ہم کہتے ہیں:

”الحمد لله رب العالمين“

”شکر و سپاس اس خدا کے لئے جو مالک ہے، عالمین کا مالک ہے۔“

پس ”رب“ کے حقیقی معنی ہیں مالک اور خداوندگار اور ربوبیت یعنی خداوندگاری، خدائی نہیں۔ خدائی اور خداوندگاری کے درمیان فرق ہے۔ جو کوئی جس چیز کا مالک ہے، وہ اس چیز کا رب اور خداوندگار بھی ہے۔

اب اس حدیث کے کیا معنی ہیں، جس میں امام نے فرمایا ہے کہ: عبودیت ایک ایسا جوہر ہے جس کی انتہا اور کنہ و حقیقت ربوبیت ہے۔

ایک نہایت خوبصورت نکتہ ہے۔ عبودیت اور خدا کی بندگی کی خاصیت یہ ہے کہ جس قدر انسان خدا کی بندگی کے راستہ کو زیادہ طے کرتا ہے اسی قدر اس کے تسلط اور قدرت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ کس طرح؟ ہم اس نشست میں فقط ایک انتہائی چھوٹے سے موضوع پر آپ کی خدمت میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں اور اس کے بعض دوسرے مسائل کی ایک فہرست بھی بیان کریں گے لیکن ایک موضوع کی وضاحت ضروری ہے۔

ربوبیت کا اولین درجہ: اپنے نفس پر تسلط

عبودیت کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ربوبیت کا اولین درجہ یہ ہے کہ انسان خود اپنے نفس کا رب اور مالک ہو جاتا ہے، اپنے نفس پر تسلط اور غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ ہماری بے چارگیوں میں سے ایک، جسے ہم مکمل طور پر محسوس کرتے ہیں، یہ ہے کہ: ہمارے نفس کی لگام خود ہمارے اختیار میں نہیں ہوتی، ہم اپنے آپ پر اختیار نہیں رکھتے، اپنی زبان پر اختیار نہیں رکھتے، اپنی شہوت پر اختیار نہیں رکھتے، اپنے شکم پر اختیار نہیں رکھتے، اپنی شرمگاہ پر اختیار نہیں رکھتے، اپنی آنکھ پر اختیار نہیں رکھتے، اپنے کان پر اختیار نہیں رکھتے، اپنے ہاتھ پر اختیار نہیں رکھتے، اپنے پیر پر اختیار نہیں رکھتے۔ اور یہ ہماری انتہائی بدبختی ہے۔ ہم ان گلی کوچوں میں چلتے پھرتے ہیں لیکن یہ آنکھ ہمارے اختیار میں نہیں ہوتی، بلکہ ہم اس آنکھ کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ آنکھ کا دل چاہتا ہے کہ نظر بازی کرے، اس کا دل چاہتا ہے کہ لوگوں کی عزتوں پر شہوت کی نگاہ ڈالے اور ہمارا دل بھی اس آنکھ کے تابع ہو جاتا ہے:

دل برود چشم چو مایل بود　　　دست نظر رشتہ کش دل بود

ہم خود اپنی زبان کے مالک نہیں ہیں، ہمیں اپنی زبان پر اختیار نہیں ہے۔ جب غصہ آتا ہے تو ہمارا دماغ گھوم جاتا ہے اور جو بھی منھ میں آتا ہے وہی بکنے لگتے ہیں۔ بغیر یہ سوچے سمجھے کہ کیا بول رہے ہیں، ایسی حالت میں نہ اپنے رازوں کی حفاظت کر پاتے ہیں نہ لوگوں کے اسرار کی۔ اس حالت میں ہم لوگوں کے عیب نہیں چھپا پاتے، اپنے آپ کو لوگوں کی غیبت سے نہیں روک پاتے (۱)

ہم کانوں پر بھی اختیار نہیں رکھتے، جو چیز ہمارے کانوں کو اچھی لگے، مثلاً انھیں غیبت اچھی لگتی ہے، تو ہم بھی اس کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں، انہیں لہو و لعب پسند ہے، تو ہم بھی تسلیم ہو جاتے ہیں۔ اپنے ہاتھ پر اختیار نہیں رکھتے، اپنے پیر پر اختیار نہیں رکھتے، اپنے غصہ پر اختیار نہیں رکھتے، کہتے ہیں خود میں بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ہوں۔ جناب! اب مجھے غصہ آ گیا ہے، جو میرے منہ میں آئے گا کہہ ڈالوں گا۔ مجھے غصہ آ گیا ہے۔ یعنی کیا؟ یعنی میں ایک ایسا آدمی ہوں جو اپنے نفس کا مالک نہیں ہوں، جوں ہی مجھے غصہ آتا ہے، میرا کنٹرول اس کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے، جو میرے منہ میں آتا ہے، کہہ ڈالتا ہوں، کیونکہ میں غصہ میں ہوں۔ ایک اور

---

(۱) یہاں چند سیکنڈ کی تقریر ریکارڈ نہیں ہو سکی ہے۔

شخص ہے جو اپنی نفسانی خواہشات کا مالک نہیں ہوتا۔ کیا انسان کو اپنے نفس کا مالک نہیں ہونا چاہئے؟ جب تک ہم اپنے نفس کے مالک نہ ہوں، کیا مسلمان ہو سکتے ہیں؟ نہیں، مسلمان کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے نفس کا مالک ہو۔

دوسرا درجہ: نفس کے خیالات کا مالک ہونا

یہاں تک ہم نے اس درجہ کے بارے میں گفتگو کی، اب ہم اس سے ایک درجہ اوپر چلتے ہیں۔ ہمیں اپنے نفس میں آنے والا خیالات کا، اپنے ضمیر کے خیالات کا مالک ہونا چاہئے اس مسئلہ پر مکمل طور پر توجہ کی ضرورت ہے۔

ہم میں سے وہ لوگ جو اپنی آنکھ کے مالک ہیں، اپنی زبان کے مالک ہیں، مضبوط قوت ارادی کے مالک ہیں، اپنے ہاتھ کے مالک ہیں، اپنے پیر کے مالک ہیں، اپنی زبان کے مالک ہیں، اپنی شہوت کے مالک ہیں، اپنے غصہ کے مالک ہیں، وہ ایک چیز کے مالک نہیں ہیں۔ ہم لوگ جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، ہم میں سے کوئی ایک بھی فرد (اپنے ذہنی اور نفسانی خیالات کا مالک نہیں ہے۔) اللہ موجود ہوں، تو مجھے نہیں معلوم۔ یعنی

کیا؟ بہر حال ہمارے ذہن میں آنے والے مفاہیم و معانی ہمارے اختیار کے بغیر اس شاخ سے اس شاخ پر اور اس ڈال سے اس ڈال پر اڑتے پھرتے ہیں۔ ہمارے خیال کی قوت ایک چڑیا کی مانند ہے۔ آپ نے درختوں پر بیٹھی چڑیا کو دیکھا ہوگا، وہ ایک شاخ سے دوسری شاخ پھر تیزی کے ساتھ دوسری شاخ سے تیسری شاخ پر اڑتی پھرتی ہے، ہماری قوۂ خیالیہ بھی کبھی اس شاخ پر تو کبھی اس شاخ پر رہتی ہے۔ اگر ہم سے کہا جائے کہ برائے مہربانی اپنے ذہن کو دس منٹ کے لئے ایک نکتہ پر مرکوز رکھئے۔ صرف ایک موضوع کے بارے میں غور و فکر کیجئے۔ کیا ہمارے لئے ممکن ہے؟؟!

ہم اور آپ سے کہا جاتا ہے کہ جب آپ نماز پڑھیں، تو آپ کا ذہن اسی جانب مرکوز رہے اور آپ میں حضور قلب پایا جائے:

"لا صلوۃ لا بحضور القلب"

"حضور قلب کے بغیر نماز قبول نہیں ہے۔"

ایسی نماز صحیح تو ہے، یعنی آپ سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ آپ نے نماز کیوں نہیں پڑھی، لیکن ایسی نماز مقبول نہیں ہے۔ یعنی ایسی نماز آپ کو کسی مقام پر نہیں پہنچاتی، جوں ہی ہم اللہ اکبر کہتے ہیں، اگر بالفرض ہم دکاندار ہیں، تو یوں محسوس ہوتا جیسے ہم نے اپنی دکان کا تالا کھول لیا ہے، حمد اور سورہ

پڑھتے ہیں، لیکن ہمارا دل دکان میں لگا ہوتا ہے، ہمارا دھیان دفتر میں ہوتا ہے، ہمارا دل اپنی فلاں ملکیت میں اٹکا ہوتا ہے، فلاں خواہش کے پیچھے ہوتا ہے۔ ہم اچانک اس وقت ہوش میں آتے ہیں، جب "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہہ رہے ہوتے ہیں۔

ہم نے (اس انداز کی) اتنی زیادہ نمازیں پڑھی ہیں کہ یہ ہماری عادت سی ہو چکی ہے۔ ہم اپنی اس روش کو ترک نہیں کر پاتے۔ اپنے آپ تھوڑی دیر میں ہی "اللہ اکبر" سے "السلام علیکم" تک پہنچ جاتے ہیں اور بغیر کچھ سمجھے بوجھے (نماز کو) ختم کر لیتے ہیں۔ حالانکہ نماز کے دوران حضور قلب اور ذہن کا مرکوز ہونا ضروری ہے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ناممکن ہے۔ نہیں، ممکن ہے، بہت ممکن ہے۔ اگر آپ عبودیہ "العبودیۃ جوھرۃ کنھھا الربوبیۃ" کے ساتھ کوشش کریں، عبودیت کی راہ میں قدم اٹھائیں تو واقعاً آپ ایسی نماز پڑھ سکتے ہیں جو اگر پانچ منٹ کی ہو تو ان پورے پانچ منٹ میں آپ صرف خدا کی طرف متوجہ ہوں، آپ دس منٹ نماز پڑھیں تو خدا کی طرف متوجہ ہوں۔ آپ کا ذہن خدا کے سوا کسی اور چیز کی طرف متوجہ ہی نہ ہو، آدھے گھنٹے، ایک گھنٹے اسی حالت میں رہیں اور پھر رفتہ رفتہ اولیاء اللہ کی مانند ہو جائیں اور اور ابتدائے شب سے صبح تک مسلسل عبادت کریں اور آپ کا ذہن خدا کے سوا کسی بھی چیز کی طرف متوجہ نہ ہو۔

اس قدر غرق ہوں کہ اگر کوئی آکر آپ کے سر کے پاس کھڑے ہو کر شور و غل بھی مچائے، تب بھی آپ نہ سنیں، نہ سمجھیں اور اس کی جانب متوجہ بھی نہ ہوں، آپ کا ذہن اس قدر مرکوز ہو جائے۔

حالت نماز میں امام سجادؑ کا حضور قلب

امام سجادؑ عبادت میں مشغول تھے۔ آپ کا بچہ چھت سے گرا اور اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ عورتیں جمع ہو گئیں اور چیخنے چلانے لگیں کہ بچے کا ہاتھ ٹوٹ گیا ہے۔ ہڈی بٹھانے والے کو لے کر آؤ لوگ گئے اور اعضا جوڑنے والے کو بلا لائے اور بچے کا ہاتھ باندھ دیا۔ بچہ رویا، عورتوں نے آہ وفغاں کی، دوسرے افراد نے بھی چیخ پکار مچائی، بات ختم ہو گئی، قصہ گزر گیا۔ عبادت سے فارغ ہونے کے بعد امام صحن میں تشریف۔ لائے، ان کی نگاہ اپنے بچے پر پڑی، دیکھا اس کا ہاتھ بندھا ہوا ہے، آپ نے پوچھا کیا ہوا؟ لوگوں نے بتایا: بچہ چھت سے گر گیا تھا، اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا تھا، ہم اعضا جوڑنے والے کو لائے، اس نے اس کا ہاتھ باندھ دیا، اس وقت آپ نماز اور عبادت میں مشغول تھے۔ امامؑ نے قسم کھا کر فرمایا کہ مجھے بالکل پتا نہیں چلا۔

ممکن ہے آپ کہیں کہ وہ امام زین العابدین علیہ السلام تھے، ہر

آدمی تو ان کی طرح نہیں ہوسکتا۔ لیکن خود ہم نے اپنی زندگی میں ایسے افراد کو دیکھا ہے البتہ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ امام کی حد تک تھے مگر ایسے افراد کو دیکھا ہے جو نماز شروع کرنے کے وقت سے لے کر اس کے اختتام تک ذکر خدا اور یاد خدا میں اس طرح ڈوب جاتے، اور نماز میں اس طرح غرق ہو جاتے تھے کہ اپنے اِردگرد سے بے خبر ہو جاتے تھے:

"العبودية جوهرة كنهها الربوبية"

"عبودیت اور بندگی کا نتیجہ اور اس کا اولین اثر یہ غلبہ اور تسلط ہے۔"

ہم نے اس نشست میں تسلط کے دو مرحلوں کو بیان کیا ہے۔ تسلط کا ایک درجہ اپنے نفس پر تسلط ہے جو تسلط کا کمترین درجہ ہے، اور اگر یہ انسان میں پیدا نہ ہو، تو انسان کو یقین رکھنا چاہئے کہ اس کی عبادتیں درگاہ الٰہی میں مقبول نہیں ہیں۔ یہ وہی چیز ہے کہ جس کی بنیاد پر قرآن نماز کے بارے میں کہتا ہے:

"انّ الصلوة تنهى عن الفحشاء والمنكر" (۱)

نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

نماز کس طرح بے حیائی اور برے کاموں کا راستہ روکتی ہے؟

---

(۱) "نماز ہر برائی اور بدکاری سے روکتی ہے۔" (سورہ عنکبوت ۴۵)

کیا نماز پولیس ہے، کہ جب آپ کسی برے کام کو انجام دینا چاہیں تو وہ آپ کو ڈھونڈ نکالے اور آپ کا راستہ روک لے؟ نہیں، نماز عبودیت اور بندگی ہے۔ اس عبودیت کا نتیجہ ربوبیت اور تسلط ہے، اور تسلط اور غلبہ کا کم از کم درجہ نفس پر تسلط اور غلبہ ہے۔

تقویٰ

تقویٰ سے کیا مراد ہے؟

یعنی اپنے آپ کو بچانا، محفوظ رکھنا۔

اپنے آپ کو بچانے سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد اپنے نفس پر تسلط ہے۔

"ان تقوی اللّٰہ حمة اولیاء اللّٰہ محارمه والزمت قلوبھم مخافته" (۱)

قرآن مجید روزہ کے بارے میں کہتا ہے:

"یاایھا الذِین آمنوا کتِب علیکم الصِیام کما کتِب علی

---

(۱) "تقویٰ ہی نے اللہ کے دوستوں کو حرام کیے گئے کاموں سے بچایا ہے اور ان کے دلوں میں خوف پیدا کیا ہے۔" (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۱۲)

الذِین مِن قبلِکم لعلکم تتقون"(۲)

اے اہل ایمان! تمہارے لئے روزہ فرض کیا گیا ہے، اسی طرح جیسے تم سے پہلے والوں پر فرض کیا گیا تھا۔ کیوں؟ قرآن روزہ کا مقصد بھی بیان کرتا ہے:

"لعلکم تتقون"

" اس لئے کہ تمہارے اندر تقوی کی روح اور تقوی کا ملکہ پیدا ہو جائے۔"

تقویٰ کے ملکہ سے کیا مراد ہے؟

اس سے مراد ہے نفس پر تسلط۔ نفس پر تسلط وہی چیز ہے جس کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے:

"العبودیة جوهرة کنهها الربوبیة"

پس اگر ہم نے ماہ رمضان گزار لیا ہے، احیا کی راتوں (شبہائے قدر) اور مسلسل روزوں کو گزار لیا ہے، اور ماہ رمضان کے بعد اپنے دل میں یہ احساس رکھتے ہیں کہ ہم اب اپنی شہوت پر ماہ رمضان سے پہلے سے زیادہ مسلط ہیں، اپنے غصہ پر پہلے سے زیادہ مسلط ہیں، اپنی آنکھوں پر ہمیں

---

(۲) "صاحبان ایمان! تم پر روزے اسی طرح فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے والوں پر فرض کئے گئے تھے، تاکہ تم متقی ہو جاؤ۔" (سورہ بقرہ ۱۸۳)

زیادہ قابو ہو گیا ہے، اپنی زبان پر پہلے سے زیادہ کنٹرول ہے، اپنے اعضاو جوارح پر زیادہ تسلط ہے، مختصر یہ کہ اپنے پورے نفس پر پہلے سے زیادہ کنٹرول رکھتے ہیں اور اب نفس امارہ کا راستہ روک سکتے ہیں، تو یہ ہمارے روزوں کی قبولیت کی علامت ہے۔

لیکن اگر ماہ رمضان گزر گیا، ختم ہو گیا، اور ماہ رمضان سے ہمارا حاصل (صرف یہ ہو کہ ہم نے ایک مہینہ بھوک اور پیاس برداشت کی ہے) جیسا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ روزہ سے بعض لوگوں کو صرف بھوک اور پیاس حاصل ہوتی ہے اور کیونکہ ہم لوگ سحری وافطار کرتے ہیں، اس لئے بھوک اور پیاس بھی نہیں لگتی۔ البتہ ہم کم از کم نڈھال تو ہو ہی جاتے ہیں اب ایک مہینہ تک نڈھال رہنے کے نتیجے میں کام کے لئے ہماری توانائی کم ہو جاتی ہے اور کیونکہ کام کاج کے لئے ہماری قوت وتوانائی کم ہو جاتی ہے تو روزہ پر الزام لگاتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ہماری کارکردگی کم ہوئی۔ جو طالب علم ہے وہ کہتا ہے کہ ماہ رمضان میں تو میری پڑھنے کی قوت کم ہو گئی، جو کوئی اور کام کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ فلاں کام کی طاقت نہ رہی۔ لہٰذا روزہ ایک بری چیز ہے۔ یہ ہمارے روزہ کے قبول نہ ہونے کی علامت ہے۔ جب کہ اگر انسان ماہ رمضان میں واقعی معنی میں روزہ رکھنے والا ہو، اگر واقعاً اپنے آپ کو بھوکا رکھے، جیسا کہ کہا گیا ہے تین

وقت کے کھانے کو دو وقت کا کر لے۔ یعنی پہلے وہ ناشتہ، دوپہر کا کھانا اور رات کا کھانا کھاتا تھا، اب دوپہر کا کھانا نہ کھائے، اس کی افطار ایک ناشتہ کی مانند مختصر ہو، اس کے بعد سحر کے وقت معدہ پر بہت زیادہ بوجھ نہ ڈالے، بلکہ معمولی غذا کھائے، تو اسے احساس ہو گا کہ کاموں کے سلسلہ میں اس کی جسمانی قوت میں اضافہ ہوا ہے، اور کار خیر کے لئے اس کی روحانی قوت بھی بڑھی ہے۔ یہ کم از کم عبادت ہے۔

ہم نے گفتگو کی ابتدا میں ایک آیت پڑھی تھی۔ آپ کی خدمت میں اس آیت کا ترجمہ پیش کرتے ہیں، جس کا مفہوم یہی ہے۔ قرآن مجید، نہج البلاغہ، اقوال امام جعفر صادق علیہ السلام و امام زین العابدین علیہ السلام میں جو باتیں مختلف الفاظ اور مختلف تعبیروں میں ملتی ہیں ان پر جب آپ نظر ڈالتے ہیں، تو دیکھتے ہیں کہ یہ سب ایک ہی حقیقت تک پہنچے ہوئے ہیں، اور ایک ہی حقیقت کا ذکر کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں دو مقام پر اللہ یوں فرماتا ہے:

"یا ایھا الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلوۃ" (۱)

صبر سے مراد روزہ ہے۔ یہ انتہائی عجیب تعبیر ہے! ہم سے مطالبہ

(۱) "اے اہل ایمان! نماز اور صبر سے مدد لو۔" (سورہ بقرہ ۱۵۳)

ہے کہ نماز اور روزہ سے مدد مانگو۔ یعنی تم نہیں جانتے کہ یہ نماز قوت کا کیسا سرچشمہ ہے! یہ روزہ طاقت کا کیسا منبع ہے! اگر تمہیں نماز پڑھنے کے لئے کہا گیا ہے، تو قوت و طاقت کے ایک سرچشمہ کی جانب تمہاری رہنمائی کی گئی ہے، اور اگر روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے تو بھی طاقت کے ایک اور سرچشمہ کی طرف تمہیں متوجہ کیا گیا ہے۔ تم اپنے نفس اور روح پر مسلط ہونے کے لئے نماز پڑھو اور روزہ رکھو "العبودية جوهرة كنهها الربوبية"

اب کیا اس ربوبیت اور تسلط کا خاتمہ یہیں پر ہو جاتا ہے؟ اس کے درجات اور مراتب ہیں۔ آپ عبادت کے راستہ پر جس حد تک بھی آگے بڑھتے جائیں گے، ربوبیت حاصل کرتے جائیں گے یعنی ولایت حاصل کرتے جائیں گے۔ یعنی آپ کو تسلط حاصل ہوتا رہے گا۔ بیان شدہ درجہ سے ایک درجہ بالاتر پہونچ جائیں گے۔ اس مقام پر پہنچ جائیں گے کہ آپ اپنے نفس کے خیالات کے مالک بن جائیں گے۔

بالاتر درجات

کیا اس سے بھی بالاتر کوئی درجہ ہے؟ ہاں، انسان کم از کم اپنے بارے میں مستجاب الدعوۃ ہو جاتا ہے۔ حتی عبودیت کے نتیجہ میں اپنے بدن

پراثر انداز ہوسکتا ہے، معجزہ دکھا سکتا ہے، کرامت دکھا سکتا ہے، "العبودیة جوهرة کنهها الربوبیة" اس کا نتیجہ تسلط ہے۔

کیا اس سے بڑھ کر بھی ہے؟

جی ہاں، لیکن یہ درجہ ہماری فہم وادراک اور ہماری فکر میں آسانی سے نہیں سماسکتا۔ بہت سے افراد یہ باور نہیں کر سکتے کہ کوئی انسان عبودیت، خدا کی بندگی اور اس کے سامنے خضوع وخشوع کے نتیجہ میں اور صراط عبودیت کو طے کرنے کی وجہ سے، اس مقام پر جا پہنچے کہ اسے کائنات میں بھی تصرف کی قدرت وتوانائی حاصل ہو جائے یعنی ایسا شخص ایک بیمار کا روحانی راستہ سے علاج کر سکتا ہے، ایک پیدائشی اندھے کو شفا دے سکتا ہے، ایک مبروص (leper) کو شفا دے سکتا ہے جیسا کہ قرآن کریم حضرت عیسی ابن مریم کے بارے میں بیان کرتا ہے اذن الٰہی سے۔ تمہیں یہ قدرت حاصل ہے۔ اذن خدا وہی قدرت ہے جو خدا عطا کرتا ہے:

"وتبرِء الاکمه والابرص باذنی واذ تخرِج الموتی باذنی "(۱)

یا ایک دوسری آیت میں:

---

(۱) "اور تم پیدائشی اندھوں کو اور برص میں مبتلا لوگوں کو ہماری اجازت سے صحت یاب کر دیتے ہو۔" (سورہ مائدہ ۱۱۰)

"واحیِ الموتی باذن الله"(۱)

یہ ایک بلند تر درجہ ہے جس کے بارے میں ہم فی الحال گفتگو نہیں کرنا چاہتے، بعد کی نشست میں انشاءاللہ آپ کی خدمت میں "قرب" کے بارے میں کچھ نکات عرض کریں گے۔ یہ جو ہم عبادت میں کہتے ہیں کہ "قربة الی الله" اس کے کیا معنی ہیں؟ تقرب خدا سے کیا مراد ہے؟ اس بات کی انشاءاللہ آپ کی خدمت میں وضاحت کریں گے۔

حضرت علی علیہ السلام ان بندوں اور عابدوں میں سے ہیں جو اس ربوبیت پر پہنچے ہوئے ہیں۔ البتہ غلط فہمی پیدا نہ ہو جائے، آپ یہ تصور نہ کیجئے گا کہ یہ عبودیت جس کا نتیجہ ربوبیت اور تسلط ہے اس کا نتیجہ خود پسندی بھی ہے۔ ہرگز نہیں، خود پسندی کا عبودیت کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں۔ کیا اس کا نتیجہ غرور اور انانیت ہو سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔

وہ بندہ جو ربوبیت کے لئے بندگی کرتا ہے، اسے اپنے عمل کا کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔ عبودیت خضوع وخشوع اور خاکساری کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے۔ حضرت علی علیہ السلام اپنی مناجات میں عرض کرتے ہیں:

"خدایا! کفی بی فخرا ان اکون لك عبدا و کفی بی عزا

(۱) "اور حکم خدا سے مردوں کو زندہ کروں گا۔" (سورۂ آل عمران ۴۹)

ان تکون لی ربا"

"بار الہا! میرے لئے یہ فخر کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں اور میرے لئے یہ عزت وشرف بہت ہے کہ تو میرا رب اور پروردگار ہے۔"

ہم حضرت علی علیہ السلام کے لئے بہت سے مقامات اور درجات کے قائل ہیں، اور قائل ہونا بھی چاہئے۔ دراصل مسئلہ ولایت، جس کے بارے میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ بغیر ولایت تکوینی کے کوئی ولایت ہی نہیں ہوسکتی۔ ایسے لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں، وہ سمجھے ہی نہیں وہ علم سے بے بہرہ ہیں۔ وہ لوگ جو ولایت تکوینی کے منکر ہیں اور حتی ولایت تکوینی ہی کو نہیں سمجھے ہیں کہ وہ کیا ہے۔ انہوں نے ایک اور چیز کو جاہلانہ طور پر فرض اور تصور کرلیا ہے اور اسی کو بار بار لوگوں سے کہا ہے، انہوں نے اسے اپنی کتابوں میں بھی لکھا ہے۔ کیونکہ ان کا ذہن ان مسائل تک نہیں پہنچتا۔ یہ لوگ بینادی طور پر نہ انسان کو سمجھ پاتے ہیں نہ خدا کی معرفت رکھتے ہیں۔ اس قسم کے مسائل کے بارے میں اظہار رائے کرنے کے لئے کچھ باتیں لازمی ہیں: اول خدا کی شناخت، دوم: انسان اور اس کے اندر پائی جانے والی صلاحیتوں کی شناخت، اور خدا سے انسان کے تقرب کے معنی اور عبودیت اور عبادت کے معنی کا ادراک۔

حضرت علی علیہ السلام جنہیں اس قدر محبوبیت حاصل ہے، یہ تمام کی

تمام ان کی عبودیت کی وجہ سے ہے۔ کیا خوب کہتے ہیں ابوسعید ابی الخیر (یا خواجہ عبداللہ انصاری)

آن کس کہ تو را شناخت جان را چہ کند
فرزند و عیال و خانمان را چہ کند
دیوانہ (۱) ہر دو جہانش بخشی (۲)
دیوانہ تو ہر دو جہان را چہ کند

ایسا شخص جو تیرا مجذوب ہو جاتا ہے، اسے ان ربوبیتوں کی کیا پرواہ جو انانیت، غرور و تکبر پیدا کرتی ہیں۔

یہ ایام در حقیقت ایک طرف تو احیا کے شب و روز ہیں، دعا، عبودیت اور بندگی کے روز و شب ہیں۔ اور دوسری طرف مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے ایام ہیں۔ اس ہستی کی شہادت کے ایام ہیں جو عظیم ترین بندگان خدا میں سے ایک ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ایسی بندگی رکھنے والا کوئی اور شخص اس کرۂ خاکی پر نظر نہیں آتا۔

حضرت علی علیہ السلام کے سر مبارک پر ضرب لگنے سے شہادت تک

---

(۱) یعنی اسے اپنا شیفتہ اور مجذوب کر لیتا ہے۔

(۲) اسی ربوبیت کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔ (العبودیۃ جوھرۃ کنھھا الربوبیۃ)

تقریباً پینتالیس گھنٹے ہوں گے۔ یعنی اس وقت تک جب کہ آپ کی روح نے عالم ملکوت کی جانب پرواز کی۔ اور ہمارے خیال میں پینتالیس گھنٹوں کی یہ مدت حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کے سب سے زیادہ تعجب خیز لمحات میں سے ہے۔ ان پینتالیس گھنٹوں میں جب انسان حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت کو دیکھتا ہے تو علیؑ کا یقین اور ایمان سب کے لئے نمایاں وآشکار ہو جاتا ہے۔ خود ان کی نظر میں یہ ایسے لمحات اور اوقات ہیں جس میں انہوں نے اپنا انعام حاصل کیا ہے۔ مقابلہ کو انتہا تک پہنچایا ہے، انتہائی سرفرازی وسربلندی کے ساتھ اپنے پروردگار کے حضور میں پہنچے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام ایک لاثانی شخصیت کا نام ہے۔ نہج البلاغہ میں آپ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ:

" احسِب النـاس ان یترکوا ان یقولوا آمنا وهم لایفتنون ولقد فتنا الذِین مِن قبلِهم فلیعلمن الله الذِین صدقوا ولیعلمن الکاذِبین" (١)

---

(۱) کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ صرف اس بات پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ وہ یہ کہہ دیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور ان کا امتحان نہیں ہوگا۔ بے شک ہم نے ان سے پہلے والوں کا بھی امتحان لیا ہے اور اللہ تو بہر حال یہ جاننا چاہتا ہے کہ ان میں کون لوگ سچے ہیں اور کون جھوٹے ہیں۔ (سورۂ عنکبوت، آیت ۲،۳)

تو میں سمجھ گیا کہ امت اسلامیہ میں فتنے پیدا ہوں گے۔ مجھے شہادت کی بڑی تمنا تھی، میری آروزتھی کہ احد میں شہید ہو جاؤں۔ مسلمانوں کے ستر افراد شہید ہو گئے۔ جب میں شہید نہ ہوا تو میں انتہائی آزردہ خاطر ہوا، رنجیدہ ہوا۔ یاد رہے کہ یہ باتیں ایک نوجوان کر رہا ہے۔ جنگ احد کے زمانہ میں حضرت علی علیہ السلام تقریباً پچیس برس کے تھے، ان کے دو چھوٹے بچے تھے، امام حسن اور امام حسین، صدیقہ طاہرہ جیسی ان کی زوجہ تھیں، اس کے باوجود شہادت کی آرزو نے علی علیہ السلام کو اس قدر بے تاب کر رکھا تھا کہ جب آپ شہید نہ ہوئے تو رنجیدہ تھے (پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے ہی ان سے وعدہ کرلیا تھا۔ شاید خود انہوں نے ہی رسول کریمؐ سے سوال کیا تھا کہ اے اللہ کے رسولؐ! میں کس انداز سے دنیا سے رخصت ہوں گا؟ پیغمبر نے فرمایا تھا کہ تم ایک شہید کی صورت میں دنیا سے جاؤ گے۔ لیکن جب آپ نے دیکھا کہ آپ جنگ احد میں شہید نہیں ہوئے، تو آپ رنجیدہ ہو گئے۔ رسول کریمؐ کی خدمت میں تشریف لے گئے اور کہا: اے اللہ کے رسولؐ! آپ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ خدا شہادت کو میرا مقدر بنائے گا تو آخر کیوں میں احد میں شہید نہیں ہوا؟ آنحضرت نے فرمایا: یا علیؑ زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا، آپ یقیناً اس امت کے شہید ہوں گے۔ اس کے بعد پیغمبرؐ نے علیؑ سے ایک سوال کیا: یا علیؑ یہ

بتایئے جب آپ بستر شہادت پر ہوں گے تو کس طرح صبر کریں گے؟ مولا کیا شاندار جواب دیا ہے{فرماتے ہیں: اے اللہ کے رسولؐ! یہ تو صبر کا مقام نہیں بلکہ خوشی کی بات اور شکر اور سپاس کا مقام ہے۔ آپ مجھے بتایئے کہ جب میں بستر شہادت پر ہوں گا تو کس طرح خدا کا شکر ادا کروں؟!

علیؑ ہمیشہ اس گم گشتہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ اجمالاً آپ جانتے تھے کہ آپ کے سر مبارک پر راہ خدا میں ضرب لگے گی۔ آپ کہا کرتے تھے کہ خدایا! وہ پیارا لمحہ، وہ خوبصورت گھڑی، وہ پرلذت اور شادمانی سے بھری ساعت کب آئے گی؟ رسول مقبولؐ نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ آپ کی شہادت ماہ رمضان میں ہوگی اور اس اکتالیس ہجری کے ماہ رمضان میں علیؑ کے دل کو معلوم تھا۔ اب ان کی تمنا پوری ہو جائے گی۔ علیؑ کے بچے یہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے بابا میں اس ماہ رمضان میں ایک عجیب انتظار کی کیفیت پائی جا رہی ہے۔ ایسے جیسے کسی بڑی بات کا انتظار کر رہے ہیں۔

رمضان کی تیرہویں تاریخ آئی، آپ نے لوگوں کے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا: خطبہ کے درمیان آپ کی نگاہ امام حسن پر پڑتی ہے، اپنی گفتگو روک دیتے ہیں، آواز دیتے ہیں حسن! بتاؤ اس مہینہ کے کتنے دن گذر گئے ہیں؟ ایک انتہائی عجیب سوال ہے۔ حضرت علیؑ خود ہر ایک سے بہتر جانتے ہیں کہ کتنے روزے گزر چکے ہیں۔ کیوں اپنے اس جوان سے دریافت کر

رہے ہیں؟ امام حسنؑ عرض کرتے ہیں: بابا جان! تیرہ دن گزر چکے ہیں۔ آپ فوراً امام حسینؑ کی طرف رخ کرتے ہیں: بیٹا حسینؑ! اس مہینہ کے کتنے دن باقی بچے ہیں؟ بالکل واضح ہے کہ جب تیرہ دن گزر چکے ہیں تو سترہ دن باقی رہ گئے ہیں بابا! سترہ روز باقی رہ گئے ہیں۔ یہ سن کر آپ اپنی ریش مبارک پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور فرماتے ہیں: بہت جلد یہ داڑھی سر کے خون سے رنگ دی جائے گی۔ آپ کو اس گھڑی اور اس دن کا انتظار تھا۔

امیر المومنین علیہ السلام نے ان پینتالیس گھنٹوں کے دوران جو خوبصورت جملے ارشاد فرمائے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے۔ دوسرے لوگ انتہائی مضطرب اور رنجیدہ تھے۔ آنسو بہا رہے تھے، رو رہے تھے، لیکن خود علی مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ فرمایا:

"واللہ ما فجانی من الموت وارد کرھتہ ولا طالع انکرتہ وما کنت الا کقارب ورد و طالب وجد"

"خدا کی قسم! اگر میں مر گیا تو مجھے کوئی کراہت نہیں ہوگی، ذرہ برابر کراہت نہیں۔ یہ میرے لئے ایک انجانی بات نہیں تھی، ایک انجانا مہمان نہیں تھا، بلکہ ایک جانا پہچانا مہمان تھا۔ اس کے بعد فرمایا: تم جانتے ہو کہ میری مثال کیسی ہے؟ میری مثال اس عاشق کی ہے جو اپنے مطلوب اور معشوق کا پیچھا کرتا ہے اور اسے پالیتا ہے۔ میری مثال اس پیاسے کی ہے جو

ایک تاریک رات میں پانی کی تلاش میں ہواور اچانک اسے پانی مل جائے ،سوچو! وہ کس قدر خوش ہوگا!

آپ کے اصحاب آگے بڑھ کر کہتے ہیں : بے شک اے امیر المومنین! آپ کے لئے یہ بڑی سعادت ہے۔ لیکن آپ کے بعد ہمارا کیا ہوگا؟ انیسویں کی شب، حضرت علیؑ کے بچوں کو محسوس ہوگیا تھا کہ آج ایک الگ طرح کی رات ہے، کیونکہ اس رات حضرت کی ایک خاص حالت تھی۔ کبھی آپ باہر تشریف لاتے تھے، آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتے اور واپس پلٹ جاتے تھے۔ اس رات علیؑ صبح تک نہ سوئے۔ آپ کے بچے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ امیر المومنینؑ کے یہاں نماز پڑھنے کی ایک مخصوص جگہ تھی۔ یعنی گھر میں ایک کمرہ تھا جہاں نماز پڑھا کرتے اور عبادت کیا کرتے تھے۔ حسن ابن علی علیہما السلام، جو اپنے گھر چلے گئے تھے، صبح طلوع ہونے سے پہلے لوٹ آئے، اپنے پدر بزرگوار کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کے نماز پڑھنے کی جگہ پر تشریف لائے، دیکھا کہ حضرت علیؑ بیٹھے ہوئے عبادت میں مشغول ہیں۔ اس موقع پر آپ نے وہ قصہ اپنے فرزند حسن سے بیان کیا جو اس رات واقع ہوا تھا۔ فرمایا: بیٹا! کل رات میں اسی طرح بیٹھا ہوا تھا یعنی کل رات میں نے بستر نہیں بچھایا تھا۔

”ملكتني عيني وانا جالس فسنح لي رسول الله صلى

اللہ علیہ و آلہ"

میری آنکھ لگ گئی، مجھ پر نیند کا غلبہ ہوا، میں نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے ایک لمحہ کے لئے پیغمبر کو دیکھا۔ جوں ہی پیغمبر پر میری نگاہ پڑی میں نے ان کی خدمت میں امت کا شکوہ کیا، میں نے عرض کی:

"یا رسول اللہ!ماذا لقیت من امتک من الاود و اللدد"

" اے اللہ کے رسول !میں نے آپ کی امت کے ہاتھوں کیا کیا ستم نہیں سہے ہیں، اور اس امت نے میرا کس کس طرح سے دل نہیں دکھایا ہے!اے اللہ کے رسول !میں آپ سے اپنے دشمنوں کی ......(۱)

(۱) آخری چند سیکنڈ کی تقریر ریکارڈ نہیں ہوئی۔

عبادت ونماز

(۲)

گزشتہ نشست میں ہم نے عبودیت، حق کی بندگی، حق کی پرستش اور ایسے آثار کے بارے میں کچھ گفتگو کی تھی جو عبودیت کے نتیجہ میں انسان کے لئے ظاہر ہوتے ہیں، امام جعفر صادق علیہ السلام کی وہ حدیث جو ''مصباح الشریعہ'' میں نقل ہوئی ہے، اسے پیش کیا تھا۔ حدیث یہ تھی:

''العبودیة جوهرة کنهها الربوبیة''

نیز اس حدیث کے بارے میں کچھ وضاحتیں عرض کی تھیں۔ لیکن گزشتہ وضاحتوں کے بارے میں مزید گفتگو کی ضرورت ہے۔ ساتھ ساتھ ہم ان نکات کے بارے میں کچھ باتیں آپ کی خدمت میں پیش کریں گے جن کا ہم نے گزشتہ نشست میں وعدہ کیا تھا، موضوع تھا ''تقرب الٰہی'' جو عبادت کی روح ہے۔ پہلے ہم آپ کی خدمت میں تقرب کا مسئلہ پیش

کرتے ہیں۔

آپ جب بھی کوئی عبادت انجام دینا چاہتے ہیں، مثلاً نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، حج انجام دیتے ہیں، یا زکات دیتے ہیں، تو نیت کرتے ہیں اور نیت میں کہتے ہیں کہ، نماز پڑھتا ہوں قربۃً الی اللہ۔ یعنی نماز پڑھتا ہوں تاکہ خدائے تبارک وتعالیٰ سے قریب ہو جاؤں۔ روزہ رکھتا ہوں قربۃً الی اللہ کے لئے یعنی اس لئے کہ خدا سے نزدیک ہو جاؤں، حج کرتا ہوں قربۃً الی اللہ، اس لئے کہ خدا کا قرب حاصل کرلوں، احسان کرتا ہوں، دوسرے انسانوں کے کام آتا ہوں، تاکہ خدا کا نیک اور مقرب بندہ ہو جاؤں ۔ہم آج کی نشت میں آپ کی خدمت میں، خدا سے نزدیک ہونے کے معنی کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ بنیادی طور پر خدا سے نزدیک ہونا کوئی معنی ومفہوم رکھتا بھی ہے یا نہیں۔ بالفاظ دیگر خدا سے نزدیک ہونا کیا ایک حقیقی نزدیکی کا نام ہے، کیا واقعی انسان کسی وسیلہ سے یا عبادت واطاعت کے ذریعہ، اب چاہے وہ عبادت و اطاعت جس شکل میں بھی ہو خدا سے نزدیک ہو جاتا ہے، پھر خدا سے واقعی نزدک ہونے کی کوئی حیثیت نہیں ہے؟

جب ''خدا کی قربت'' یا ''خدا سے نزدیک ہونا'' جیسے الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد ایک مجازی تعبیر ہوتی ہے، حقیقی نہیں۔

کس طرح؟

ہم آپ کی خدمت میں دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ایک وہ جس میں ایک شئے کی دوسری شے سے نزدیکی حقیقی ہے اور دوسری وہ جہاں ایک شے کا دوسری شے سے نزدیک ہونا مجازی ہوتا ہے، حقیقی اور واقعی نہیں۔

حقیقی طور پر نزدیک ہونا

جہاں نزدیک ہونے سے ہماری مراد حقیقی طور پر نزدیک ہونا ہے وہ یہ ہے کہ آپ تہران سے قم جانا چاہتے ہیں، آپ جتنا چلتے چلے جائیں گے اتنا ہی آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں قم سے قریب ہو رہا ہوں اور تہران سے دور۔ یہاں قم سے آپ کا قریب ہونا ایک حقیقی معنی اور مفہوم رکھتا ہے۔ یعنی آپ جو تہران میں ہیں، آپ کے اور شہر قم کے درمیان ایک حقیقی فاصلہ موجود ہے، اور آپ سفر کے ذریعہ تدریجاً اس فاصلہ کو کم کر رہے ہیں۔ لہٰذا آپ کہتے ہیں کہ میں شہر قم سے نزدیک ہو رہا ہوں۔ یہ نزدیک ہونے کے ایک معنی ہیں۔ حقیقتاً آپ تہران سے چل کر قم کی طرف جا رہے ہیں، آپ کے اور قم کے درمیان ایک فاصلہ ہے، اور تدریجاً یہ فاصلہ کم ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ آپ قم پہنچ جاتے ہیں۔ آپ اس قدر نزدیک ہوجاتے ہیں کہ

پھر ''نزدیکی'' کا لفظ بھی تقریبا بے معنی ہو جاتا ہے۔ یعنی آپ اب قم پہنچ گئے ہیں۔ یہ نزدیک ہونا، حقیقی طور پر نزدیک ہونا ہے۔

مجازی طور پر نزدیک ہونا

ہم ایک اور طرح کے نزدیک ہونے سے بھی واقف ہیں، جو تعبیر تو ہے، مگر حقیقی طور پر نزدیک ہونا نہیں ہے۔

وہ کس طرح؟

آپ ایک عہدہ و منصب کے حامل شخص، یا کسی دولت مند شخص کو پیش نظر رکھئے، جس کے پاس بہت زیادہ طاقت اور مال و دولت ہے۔ جیسے ہم بعض افراد کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ فلاں عہدیدار سے نزدیک ہے، فلاں شخص فلاں عہدیدار سے نزدیک ہے۔ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ آپ فلاں صاحب نفوذ شخص سے نزدیک ہیں یا نہیں؟ جوابا آپ کہتے ہیں: نہیں۔ میری وہاں تک پہنچ نہیں ہے۔ فلاں شخص اس سے بہت نزدیک ہے۔

کیسے؟

یعنی جب کسی قدرت مند اور منصب و مقام کے حامل شخص سے کوئی

کام پڑتا ہے، تو انسان چاہتا ہے کہ ایک ایسے شخص کے پاس جائے جو اس سے نزدیک ہو، وہ اس کا تعارف کرائے اور اس کی مشکل حل ہو جائے۔

تو پھر یہ نزدیک ہونا کس قسم کا نزدیک ہونا ہے؟ اگر آپ کہتے ہیں کہ ایاز، سلطان محمود سے نزدیک تھا، تو اس نزدیک ہونے سے کیا مراد ہے؟ آپ کو ہر بزرگ ہستی یا صاحب نفوذ شخص کے حوالہ سے اس قسم کی چیز نظر آئے گی۔ مثلا کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نزدیک تھے۔ کیا اس سے مراد یہ ہے کہ ہمیشہ پیغمبرؐ اور علیؑ کے درمیان مکانی فاصلہ کم رہا کرتا تھا؟ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمیشہ دوسرے افراد پیغمبر سے ایک فاصلہ پر ہوتے تھے اور وہ شخصیت جس کے جسم کا فاصلہ پیغمبر کے جسم سے سب سے زیادہ کم تھا وہ علی تھے؟

جب آپ کہتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں عہدیدار سے قریب ہے؟ تو کیا آپ کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کا مکانی و جسمانی فاصلہ کم ہے؟ نہیں، یہ مراد نہیں ہوتی۔ اگر اس طرح ہو، تو عہدیدار کے دروازہ پر رہنے والا چپراسی، دوسرے تمام لوگوں کی بنسبت زیادہ نزدیک ہوگا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ اس سے صرف تین چار میٹر کے فاصلہ پر رہتا ہے اور اس کی خدمت کے لئے تیار رہتا ہے۔ کوئی اور شخص اس عہدیدار کے چپراسی سے زیادہ اس سے نزدیک نہیں ہونا چاہئے۔ حالانکہ آپ کی مراد یہ نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں

کہ وہ چپراسی ان معنی میں جو آپ کہہ رہے ہیں، اس شخص سے نزدیک نہیں ہے بلکہ وہ تو نزدیک ہی نہیں ہوتا۔

تو پھر کیا مراد ہوتی ہے؟

مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کے دل میں، اس کے ذہن میں اس انسان کو ایسی محبوبیت اور ایسا احترام حاصل ہے کہ وہ اس کی بات نہیں ٹالتا، اس کی خواہش رد نہیں کرتا، اس کی خواہش اس کے لئے ایسے ہی ہے جیسے خود اس کی اپنی خواہش ہو۔ یہ قرب معنوی قرب ہے۔ لیکن یہ معنوی قرب بھی در حقیقت ایک تعبیر ہے، مجازی قرب ہے۔ یعنی دوسرا شخص کسی شخص کے لئے بھی خود اس سے زیادہ نزدیک نہیں ہو سکتا بلکہ یہ فقط انسان کے ذہن اور روح میں ایک خاص محبوبیت کا حامل ہے، اس کا لطف اس کے شامل حال ہے، قرب و نزدیکی کے یہی معنی ہیں۔

خدا سے تقرب کے کیا معنی ہیں؟

یقینی طور پر پہلے معنی والی نزدیکی مراد نہیں ہے۔

یعنی جب کہا جاتا ہے کہ بندہ عبادت کی وجہ سے خدا سے نزدیک ہو جاتا ہے، تو اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ اس بندہ کا خدا سے مکانی و جسمانی فاصلہ کم ہو جاتا ہے۔ یعنی پہلے اس کے اور خدا کے درمیان فاصلہ موجود تھا، اب تدریجاً وہ اس سے نزدیک تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ فاصلہ بالکل

ختم ہو جاتا ہے اور وہ مرحلہ (آپہنچتا ہے) جس کے متعلق قرآن مجید کہتا ہے کہ:

"یاایھاالانسان انك كادح الی ربك كدحا فملاقيه"[۱]

جس کا نام پروردگار عالم سے ملاقات اور لقاء اللہ ہے۔ وہ جسموں کی مانند جو ایک دوسرے کے نزدیک آجاتے ہیں۔ مثلاً جس طرح آپ قم پہنچ جاتے ہیں، ویسے ہی بندہ خدا تک پہنچ جاتا ہے۔ واضح ہے کہ یہاں اس قسم کے معنی مراد نہیں ہیں اور یقیناً یہ مراد ہو ہی نہیں سکتی۔

کیوں؟

ان دسیوں عقلی دلائل سے چشم پوشی کرتے ہوئے جو اس مقام پر پیش کی جاتی ہیں جیسے خدا اپنے بندوں سے فاصلہ پر نہیں ہے، خدا کا کوئی مکان نہیں ہے، جس کی بنا پر اس قسم کا فاصلہ فرض ہو سکے، قرآن اور اسلام کی منطق کے لحاظ سے بھی، یعنی نقلی منطق کے لحاظ سے بھی، جس نے ہمیں خدا سے قرب اور نزدیکی کا حکم دیا ہے، زلفا عند اللہ کا حکم دیا ہے، وہی جس نے ہم سے کہا ہے کہ خدا کا قرب حاصل کرو۔ اس لئے کہ کوئی خدا سے دور ہوتا ہے تو کوئی

---

(۱) اے انسان! تو اپنے رب کی طرف جانے کی کوشش کر رہا ہے، تو ایک دن اس کا سامنا کرے گا۔ (سورۂ انشقاق ٦)

نزدیک، وہی منطق کہتی ہے کہ خدا تمام موجودات سے نزدیک ہے، خدا کسی موجود سے دور نہیں:

"ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوِس بِہٖ نفسہ ونحن اقرب اِلیہِ مِن حبلِ الورِیدِ"(۱)

ہم انسان کی رگ گردن سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ دوسری آیت:

"وہو معکم این ما کنتم"(۲)

تم جہاں کہیں ہو، خدا تمہارے ساتھ ہے۔ خدا کسی مخلوق سے دور نہیں ہے۔

لہٰذا ان جگہوں پر فاصلہ کو کم کرنے کا کوئی مطلب نہیں پایا جاتا۔ تاہم ایک بات ضرور ہے جسے ہم بعد میں عرض کریں گے۔ خدا تمام لوگوں سے مساوی طور پر نزدیک ہے۔ بلکہ تمام اشیاء سے یکساں طور پر نزدیک ہے۔ لیکن اشیا مساوی طور پر خدا سے نزدیک نہیں ہیں۔ بعض اشیاء خدا سے دور ہوتی ہیں لیکن خدا تمام اشیا سے نزدیک ہے، اور اس میں بھی ایک راز پوشیدہ

---

(۱) اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ اس کا نفس کیا کیا وسوسے پیدا کرتا ہے اور ہم اس سے رگ گردن سے زیادہ نزدیک ہیں۔ (سورہ ق ۱۶)

(۲) اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں بھی رہو۔ (سورہ حدید ۴)

ہے، جسے شاید آپ کے لئے عرض کرسکوں۔ بہر حال ایسے مقامات پر یہ بالکل مراد نہیں ہوتی کہ مثال کے طور پر دو چیزوں کے درمیان فاصلہ ہو اور ہم عبادت کے ذریعہ ان دو چیزوں کا مکانی و جسمانی فاصلہ کم کریں۔

کیا دوسرا معنی مراد ہے؟

کیا خداوند عالم کا قرب، معاشرتی عہدہ و مقام کی حامل ہستیوں سے تقرب کی مانند ہے؟ بالفاظ دیگر کیا خدا سے تقرب صرف ایک تعبیر ہے جسے ہم استعمال کرتے ہیں؟ کیا ایک مجاز ہے جسے ہم استعمال کرتے ہیں؟ ٹھیک اسی طرح جیسے ہم روزمرہ کی گفتگو میں محاوروں کا استعمال کرتے ہیں؟ کیا ایک ایسی بات ہے جو واقعی نزدیک ہونے کے معنی میں نہیں ہے اور ہم نے لطف و عنایت والتفات کو تقرب کا نام دے دیا ہے؟ بہت سے افراد حتی بہت سے علماء کا یہی تصور ہے۔ کہتے ہیں پروردگار سے تقرب کے یہی معنی ہیں یعنی یہ صرف ایک تعبیر اور مجاز ہے۔

یعنی جب یہ کہا جائے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ خدا سے نزدیک ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ دوسرے تمام انسانوں سے زیادہ خدا کی بارگاہ میں مقرب ہیں۔ اور آپ پر اس کی عنایت اور لطف سب سے زیادہ ہے۔ بلا تشبیہ ایک مثال سے بات واضح کردوں۔ ممکن ہے آپ کے ایک سے زیادہ بچے

ہوں، اوران بچوں میں سے ایک بچہ آپ کے ذوق، مزاج اور آئیڈیل سے زیادہ مطابقت رکھتا ہو۔ آپ کہتے ہیں کہ اپنے بچوں میں سے یہ بچہ دوسرے بچوں کی نسبت میرے سب سے زیادہ قریب ہے۔ یعنی ان سب سے زیادہ میری توجہ کا مرکز ہے۔ اگرچہ آپ کے تمام بچے، جسمانی اعتبار سے مساوی طور پر آپ سے نزدیک ہیں، سب کے سب ایک ہی گھر میں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ بچہ جسے آپ کم پسند کرتے ہیں وہ آپ کے نزدیک بیٹھ جاتا ہے اور وہ بچہ جسے آپ زیادہ پسند کرتے ہیں وہ آپ سے دو میٹر فاصلہ پر بیٹھتا ہے۔

کہتے ہیں کہ پروردگار کا مقرب بندہ ہونے کے معنی اس کے سوا کچھ اور نہیں ہیں کہ وہ شخص دوسروں سے زیادہ پروردگار کی عنایت کا مرکز ہو۔ ورنہ یہ بے معنی بات ہے کہ ہم خدا کی طرف چلتے رہیں اور مکانی فاصلہ کم ہوتا جائے۔ اسی طرح یہ بات بھی بے معنی ہے کہ خدا ہماری طرف آئے اور ہم سے نزدیک ہو جائے۔ ہمارے واقعی اور بیان شدہ معنی کے مطابق واقعاً خدا سے نزدیک ہونے کے کوئی معنی نہیں۔ خدا تو ہر چیز سے نزدیک ہے ہی۔ ہم خدا سے نزدیک ہو جائیں اس کا کیا مطلب ہے؟

قرب الٰہی کے معنی

لیکن وہ علماء جو گہری نظر رکھتے اور عمیق معرفت کے حامل ہیں کہتے ہیں کہ نہیں، بات یہ نہیں ہے۔ خدا سے نزدیک ہونا، حقیقی طور پر نزدیک ہونا ہے، مجازی اور فرضی طور پر نزدیک ہونا نہیں۔ انسان حقیقتاً خدا سے نزدیک تر ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ تصور نہ آئے کہ اس نزدیک ہونے کے معنی فاصلے کم کرنا ہے۔ فاصلہ کی بات نہیں ہے۔

پھر کیا بات ہے؟ کہتے ہیں کہ خداوند تبارک وتعالی کمال مطلق ہے، وجودِ بے حد ہے، ہستی کا لامتناہی مرکز ہے، وہ علم محض ہے، عین علم ہے۔ (مشہور فلسفی عالم) میر داماد کے الفاظ میں:

"علم کلة و کلـه العلم، قدر و کله القدر، حياة كله و كله الحياة، ارادة كله و كله الارادة"

وہ کمال مطلق ہے۔ موجودات جوں جوں اپنے وجود کے واقعی کمالات حاصل کرتے جاتے ہیں اسی قدر ہستی کے مرکز، محور اور حقیقت سے واقعاً نزدیک ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ نزدیک ہونا واقعی نزدیک ہونا ہے، جسمانی نزدیکی نہیں لیکن واقعی اور حقیقی نزدیکی ہے، مجاز اور تعبیر نہیں ہے۔

(یہ تقرب) ایک انسان کے کسی معاشرتی مقام کے حامل شخص کے مقرب ہو جانے یا ایک بچے کے اپنے باپ کے مقرب ہونے کی طرح نہیں ہے، جو اس معنی میں ہے کہ اس کے لطف کے آثار زیادہ ہیں۔ نہیں، واقعاً پیغمبر ہماری نسبت خدا سے زیادہ نزدیک ہیں، حقیقتاً امیر المومنین ہماری نسبت خدا سے زیادہ نزدیک ہیں، اور یہ قرب واقعی قرب ہے۔ نتیجہ میں جہاں ہم عبادت کرتے ہیں، عبودیت انجام دیتے ہیں، اگر واقعی ہماری عبودیت، عبودیت ہو، تو ہم قدم بقدم خدا کی طرف حرکت کرتے ہیں یہاں جو ہم "قدم" کہہ رہے ہیں، تو یہ بھی ایک تعبیر ہے، کیونکہ اس مقام پر یہ کلمات درست نہیں ہیں، ہم "سیر" کہتے ہیں۔ کیونکہ علی ابن الحسین علیہ السلام جیسے اشخاص نے یہی لفظ استعمال کی ہے، لہٰذا ہم بھی یہی استعمال کر رہے ہیں۔

امام علی ابن الحسین فرماتے ہیں:

"اللھم انی اجد سبل المطالب الیک مشرع و مناھل الرجا لدیک مترع واعلم انک للراجین بموضع اجاب وللملھوفین بمرصد اغاثۃ"

یہاں تک کہ فرماتے ہیں:

"وان الراحل الیک قریب المسافہ"

بارالہا! جو مسافر تیری طرف حرکت اور کوچ کرتا ہے، اس کا فاصلہ

نزدیک ہے، اسے بہت دور کا راستہ طے نہیں کرنا ہوتا، اس کی مسافت نزدیک ہے۔

عالم تشیع میں عظیم خزانے موجود ہیں، انہی میں سے یہ دعائیں بھی ہیں، خدا کی قسم یہ معرفت کے خزانے ہیں، اگر ہم اپنے پاس موجود ان دعاؤں کے سوا کوئی اور دلیل نہ بھی رکھتے ہوں، ہمارے پاس اگر علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی صحیفہ علویہ، امام زین العابدین علیہ السلام کی صحیفہ سجادیہ اور صحیفہ سجادیہ کے علاوہ آپ کی دیگر دعاؤں کے خزانہ کے علاوہ اور کچھ بھی نہ ہو، اگر ہمارے پاس علی ابن ابی طالب علیہما السلام کی دعائے کمیل اور علی ابن الحسین علیہما السلام کی دعائے ابوحمزہ ثمالی کے سوا کوئی اور دعا نہ بھی ہو اور اسلام کے پاس چودہ صدیوں میں ان کے علاوہ کوئی اور چیز نہ ہو، تو اسلام کے ان دو رہبروں کے ذریعہ، اس جاہلیت کی شکار دنیا میں ان دو جواہر پاروں کا موجود ہونا ہی کافی ہے۔ یہ اس قدر رواج و رفعت کی حامل ہیں کہ انہیں معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

بہر حال کہتے ہیں کہ، تقرب، تقرب واقعی ہے، حقیقت ہے اور انسان واقعی خدا سے نزدیک ہو جاتا ہے۔

خدا سے اس طرح نزدیک ہونے کے کیا معنی ہیں؟

یعنی خدا جو کمال مطلق ہے، ہم اس سے مسلسل زیادہ سے زیادہ کمال

حاصل کریں۔ خدا علم علی الاطلاق ہے، لہٰذا ہمارے علم، ایمان اور بصیرت میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ خدا قدرت علی الاطلاق ہے، لہٰذا ہماری قدرت میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ خدا حیات علی الاطلاق ہے، ہماری حیات اور ارادے میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ یہی عبودیت ہے، یہی بندگی ہے۔ شاعر کے بقول: بندگی کن تا کہ سلطنت کنند، یا امام جعفر صادق علیہ السلام کے الفاظ ہیں:

"العبودية جوهر كنهها الربوبية"

عبودیت کے راستے پر جس قدر آگے بڑھو گے، اتنا ہی تمہارے اختیار اور تمہارے تسلط اور قدرت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ یعنی عبادت قدرت اور تسلط کے حصول کا راستہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ تسلط کس قسم کا ہے؟ اس تسلط کو ہم پانچ مرحلوں یا ایک اعتبار سے چھ مرحلوں میں آپ کی خدمت میں واضح کریں گے۔ اس کے آخری مراحل پر روشنی ڈالنے کے لئے مختصر نشستوں میں گنجائش نہیں ہے، اس کے لئے زیادہ وقت چاہئے۔ لیکن چونکہ پہلے مراحل تو عرض کرنا ہی ہیں لہٰذا ہم آخری مرحلہ کا مختصر طور پر تذکرہ بھی ضروری ہے۔ گذشتہ نشست میں ہم نے اس کے کچھ حصوں پر روشنی ڈالی تھی۔

عبادت کا پہلا اثر اپنے آپ پر تسلط

عبادت جو انسان کو خدا سے نزدیک کرتی ہے، اس کا پہلا اثر اپنے نفس پر تسلط ہے یہاں سے آپ سمجھ جائیں کہ کونسی عبادت مقبول ہے، اور کون سی عبادت قبول نہیں۔ ایسی عبادت جو انسان کو خدا سے نزدیک نہ کرے، عبادت نہیں ہے۔ یعنی آپ یقین نہ کیجئے گا کہ کوئی اِنسان درست طریقہ سے عبادت کرے لیکن خدا سے نزیک نہ ہو۔ یہ محال ہے۔ عبادت خداوند عالم سے تقرب اوراس سے نزدیک ہونے سے عبارت ہے۔ میری اور آپ کی عبادت اس وقت مقبول ہے، جب وہ ہمیں خدا سے نزدیک کرے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ انسان خدا سے، کائنات کے اس لامتناہی مرکز سے نزدیک ہو لیکن اس کی بصیرت، ایمان اور نور میں اضافہ نہ ہو، اس کی قدرت، حیات، ارادہ اور اپنے آپ پر تسلط میں اضافہ نہ ہو۔

پہلا مرحلہ وہ پہلی علامت ہے جس کے ذریعہ سے یہ پتہ لگایا جاتا ہے کہ ہماری عبادت بارگاہ خداوندی میں قبول ہوئی یا نہیں؟ یہ پہلی علامت ہمارے عمل کی مجموعی قدو قیمت ہے۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟ یہ عبادت جو بار بار کی جاتی ہے اور بالخصوص نماز جس کا سب سے اعلیٰ مظہر ہے، اس کا مقصد

کیا ہے؟اس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ یہ بات ہمیشہ ہمارے ذہن میں رہے کہ ہم بندے ہیں اور ہمارا ایک مالک ہے۔

بسا اوقات بعض افراد سوال کرتے ہیں کہ ہمارے نماز پڑھنے سے خدا کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ خدا کو کیا ملے گا جو ہم نماز پڑھیں؟

کوئی کہتا ہے: آپ کہتے ہیں کہ ہم نماز پڑھیں، خدا کے سامنے اس کی بندگی کا اظہار کریں، کیا خدا نہیں جانتا کہ ہم اس کے بندے ہیں جو ہم بار بار جا کر اس کی بارگاہ میں کھڑے ہوں اور بندگی کا اعلان کریں، تعظیم کریں، خوش آمد کریں، تا کہ خدا کہیں بھول نہ جائے کہ اس کا ایک ایسا بندہ بھی ہے۔ اور واقعی اگر خدا بھول جاتا ہے، تو ایسا خدا تو خدا نہ ہوا۔ آپ تو کہتے ہیں کہ خدا کبھی نہیں بھولتا، تو پھر ہم کس لئے عبادت کریں؟

نہیں جناب، نماز اس لئے نہیں ہے کہ خدا کہیں بھول نہ جائے کہ اس کا ایک بندہ اور موجود ہے، بلکہ نماز اس لئے ہے کہ بندہ کہیں یہ نہ بھول جائے کہ اس کا ایک خدا بھی ہے۔ نماز اس لئے ہے کہ ہمیشہ ہمیں یاد رہے کہ ہم بندے ہیں۔ ہمیں کوئی آنکھ دیکھ رہی ہے وہ ہمارے دل میں موجود ہے، پوری کائنات میں موجود ہے۔ کہیں ہم یہ بات نہ بھول جائیں کہ ہم بندے ہیں، لہٰذا ہماری خلقت بے کار نہیں ہے، ہم بندے ہیں، لہٰذا ہمارے کچھ فرائض اور ذمے داریاں ہیں۔ پس جب ہم نماز پڑھتے ہیں اور بار بار اللہ

اکبر، لاحول ولاقوۃ الا باللہ، سبحان اللہ کہتے ہیں، اور اپنی عبودیت کا اعلان اور اظہار کرتے ہیں، کہ ہم بندے ہیں، تو اس کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی یاد ہمیشہ ہمارے دل میں رہے۔

اس کا فائدہ کیا ہے؟

اس مرحلے میں اس کا فائدہ یہ ہے کہ کہ ہمیں یاد رہے کہ ہم بندے ہیں، ہمیں یاد رہے کہ ہمارے فرائض ہیں، ہمیں یاد رہے کہ دنیا میں خدا کا قانون موجود ہے اور اس قانون پر عمل ہونا چاہئے، ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ایک عادلانہ قانون اور نظام موجود ہے۔

ابن سینا کا کلام

عظیم اسلامی فلسفی، بوعلی سینا نے اسلام کی روشنی میں کچھ مسائل کا ذکر کیا ہے، اس سے پہلے کسی یونانی اور غیر یونانی فلسفی نے ان مسائل کا ذکر نہیں کیا تھا۔ انہیں میں سے ایک مسئلہ وہ یہ چھیڑتے ہیں کہ انسان مدنی الطبع ہے۔ اس کے بعد عبادت کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اجتماعی نکتہ نظر سے (وہ اجتماعی نقطۂ نظر سے بھی گفتگو کرتے ہیں اور غیر اجتماعی نقطۂ نظر سے بھی) انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے خدا

کو پہچانتا ہو اور اسے پہچاننے کے بعد متوجہ ہو کہ خدا کی جانب سے انسانی زندگی کے لئے ایک عادلانہ قانون موجود ہے اور پھر واجب اور لازم ہے کہ عبادت کا وجود ہو۔ عبادت بھی بار بار ہونی چاہئے، تا کہ ہمیشہ انسان کو یاد رہے کہ وہ بندہ ہے اور اس کا ایک خدا ہے۔ جب اس کی روح میں یہ یاد دہانی اور تلقین موجود ہوگی، تو یہ اس کے گناہ اور معصیت کا شکار ہونے میں مانع ہوگی۔ وہ ظلم کرنا چاہے گا تو نماز آ کر اس کی آنکھوں کے سامنے مجسم ہو جائے گی اور کہے گی کہ تو نے تو عبودیت کا اقرار کیا ہے، تو نے تو کہا ہے کہ میں آزاد نہیں ہوں پس کیوں ظلم کرنا چاہتا ہے؟ (۱) یہاں کونسا قانون پایا جاتا ہے؟ کہتے ہیں:

"وفرضت علیھم العباد المفروض بالتکریر"

عبادت اس لئے واجب کی گئی ہے تا کہ انسان کی روح میں ایک ایسی قوت پیدا ہو کہ اس قوت کے اثر سے جو ایمان سے تجدید عہد ہے مسلسل اس کے ایمان کی تجدید ہوتی رہے اور یہ ایمان گناہ کرنے میں مانع ہو جائے۔

یہ اس تسلط کا اولین درجہ ہے جو اپنے اوپر انسان عبادت کے ذریعہ

---

(۱) یہاں کیسٹ میں چند سکنڈ کی تقریر ریکارڈ نہیں ہوئی ہے۔

حاصل کرتا ہے۔اس مرحلہ کو ہم نے گذشتہ نشست میں ایک حد تک آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ عبادت کی ایک یقینی خصوصیت انسان کا خود اپنے نفس پر تسلط ہے۔یعنی انسان کا اپنی خواہشات پر تسلط۔ ہوس اقتدار، جبلی خواہشات، جملہ اعضاء و جوارح: آنکھ، زبان، کان، ہاتھ، پیر غرض پورے وجود پر تسلط عبادت کی س وہ خاصیت ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اگر یہ خاصیت نہ ہوتو عبادت عبادت نہیں۔اور یہ قرآن کریم کا واضح اعلان (نص) ہے۔

"ان الصلو تنهى عن الفحشا والمنكر" اور "العبودية جوهرة كنهها الربوبية" کے پیش نظر یہ واضح ہے کہ اختیار، قدرت و تسلط کا اولین مرحلہ یعنی جبلی خواہشات اور نفسانی شہوات پر غلبہ اور اعضاء و جوارح پر تسلط لامحدود قدرت کے مالک خدا سے قربت کی پہلی علامت ہے۔یعنی پورا نفس خود ہمارے کنٹرول میں ہو۔

اس مرحلہ کا تعلق عام افراد سے ہے۔عام افراد بھی اگر عبادت کریں اور بہت زیادہ مشق نہ بھی کریں تب بھی اس مرحلہ تک پہنچ سکتے ہیں۔تو اس سے یہ تصور نہ کیجئے گا کہ پھر ہماری اور آپ کی کوئی ذمہ داری ہی نہیں ہے، نہیں بلکہ ہماری تو بہت اہم ذمہ داری ہے۔

قوۂ خیالیہ پر تسلط

اس مرحلہ سے گذرنے کے بعد بعد کا مرحلہ آتا ہے اور وہ ہے اپنے تصورات اور خیالات پر تسلط۔ یعنی ابھی ہم اور آپ جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، دن کے وقت اپنے کام کاج اور روزگار کے سلسلہ میں مشغول ہوتے ہیں، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے تصورات اور خیالات ہمارے اختیار میں ہیں اور ہم اپنے اوپر حاکم ہیں۔ ہم اس بات سے واقف نہیں ہوتے کہ ہم پر ہمارے فکر و خیال کا حکم چلتا ہے۔ یہاں فکر سے مراد قوۂ خیالیہ ہے یعنی کچھ بکھرے ہوئے افکار ہم پر حاکم ہوتے ہیں۔ آپ کسی محفل میں ہوں وہاں ایک گھنٹہ تک آپ اپنا ذہن کسی خاص موضوع پر اس انداز سے مرکوز کر سکیں کہ آپ کی قوۂ خیالیہ آپ کے قابو سے باہر نہ نکل سکے تب پتہ چلے گا کہ آپ اپنے فکر و خیال پر مسلط ہیں یا نہیں۔

نماز حضور قلب کے لئے ہے۔ حضور قلب دراصل کیا ہے؟ یہ حضور قلب کا مسئلہ ایک انتہائی عجیب مسئلہ ہے۔ حضور قلب، یعنی دل حاضر ہو، غائب نہ ہو۔ یعنی جب آپ نماز پڑھ رہے ہوں اور آپ قبلہ رخ ہوں، تو اپنا جائزہ لیں، دیکھیں کہ آپ کا دل نماز میں حاضر ہے یا غائب؟ آپ نماز

کی ابتدا میں اپنے دل کو دیکھتے ہیں، وہ حاضر ہوتا ہے۔ آپ کا دل بھی چاہتا ہے کہ وہ حاضر رہے۔ جب آپ اللہ اکبر ، بِسمِ اللّٰہِ الرحمنِ الرحِیمِ الحمدلِلّٰہِ ربِ العلمِین کہتے ہیں، تو یکا یک آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ جماعت کا یہ طالب علم بھاگ گیا ہے، آپ نے اول سے آخر تک درس تو دیا ہے لیکن طالب علم کلاس میں نہیں تھا۔ جب ہم نماز پڑھتے ہیں اور الحمدلِلّٰہِ ربِ العلمِین ۔ کہتے ہیں تو اپنے دل کو سمجھانا چاہتے ہیں، اپنی روح کو تلقین کرنا چاہتے ہیں لیکن جب ہم السلام علیکم ورحمة اللّٰہ وبرکاتہ کہتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ یہ ہمارا جسم، یعنی ہماری زبان اور ہمارے اعضا و جوارح ہمارے دل کو درس دینے میں مشغول تھا اور جماعت کا طالب علم یہ دل تھا لیکن افسوس کہ یہاں صورتحال یہ تھی کہ ہم نے درس دیا، جماعت کے طالب علم نے ابتدا میں اپنے حاضر ہونے کا اعلان کیا اور بعد میں بھاگ گیا مگر ہم درس دیتے رہے۔

ہم سے حضور قلب کے لئے کہا گیا ہے، نماز میں تمہارا دل حاضر رہے، غائب نہ ہو۔ اس بارے میں اب بھی بہت سی باتیں ہیں۔ علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام کی ایک روایت ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے اور علما میں سے جس نے سب سے بہتر انداز میں اس پر روشنی ڈالی ہے وہ شیخ الرئیس بو علی سینا ہیں، عارف کی عبادت کے باب میں

کہتے ہیں:

"والعبادة عند العارف رياض ما لهممه وقواه المتخيل والمتوهم ليجرها بالتعويد عن جناب الغرور الى جناب القدس"

یہ عین حدیث کا مفہوم ہے۔ ایک درس ہے جو بوعلی نے پیغمبر اور ائمہ سے لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک عارف انسان جب عبادت کرتا ہے، ایک دانا جب بندگی میں مشغول ہوتا ہے تو عبادت کے دوران ہر چیز سے زیادہ اپنے قوۂ خیالیہ کے تمرکز کو اہمیت دیتا ہے تا کہ اس کا ذہن خدا کی طرف متوجہ رہے اور قوۂ خیالیہ بھی ہمیشہ حاضر رہے اور کلاس سے فرار نہ کرے۔

دل رسول اکرمؐ کی نظر میں

دل کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ارشاد ہے۔ یہی دل جو ہمارے پاس ہے، یہی جو ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ انتہائی عجیب ارشاد ہے! آپ ایک مثال بیان کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

"انما مثل هذا القلب كمثل ريش فى فلا معلق على شجر تقلبها الريح ظهر البطن"

انسانوں کے دل کی مثال ایک پر کی ہے۔ اگر آپ ایک پر کو صحرا و بیابان میں ایک درخت پر لٹکا دیں، اس کے بعد یہ دیکھیں کہ کیا یہ پر ایک حالت میں ٹھہرا رہتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ مسلسل کبھی اس طرف اور کبھی اس طرف ہوتا رہتا ہے۔ ہوا کا ایک انتہائی معمولی جھونکا، جس کے چلنے کا آپ کو احساس بھی نہیں ہوتا، اس کے اثر سے یہ پر اُس شاخ پر ہلنے لگتا ہے۔ کہتے ہیں بنی آدم کے قلب جس سے یہاں قوۂ خیالیہ مراد ہے کی مثال اسی پر کی ہے جو ایک جگہ نہیں ٹھہرتا، اس شاخ سے اس شاخ پر اڑتا پھرتا ہے، انسان کے اختیار سے باہر ہے۔ اس پر کی مثال ہے جو بیابان میں ایک شاخ پر آویزاں ہو، جو ایک جگہ نہیں ٹھہرتا۔ مولانا روم اسی مفہوم کو نظم کرتیہیں:

گفت پیغمبر کہ دل ہچون پری است

در بیابانی بہ دست صرصری

کیا تمام دل اسی طرح کے ہوتے ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں۔

آپ کے دل میں خیال پیدا ہوگا کہ کیا حضرت علی ابن ابی طالب علیہما السلام کا دل بھی نعوذ باللہ اسی طرح کا تھا؟ نہیں، ایسا نہ تھا۔ نہ صرف علی ابن بی طالب علیہما السلام بلکہ ان کے معمولی سے شاگرد بھی اس طرح کے نہیں تھے۔

کیا اویس قرنی، عمار یاسر اور کمیل ابن زیاد نخعی اس طرح کے تھے؟

نہیں ہرگز نہیں۔

حتی ان سے بھی کم تر لوگوں کو ہم نے دیکھا ہے۔ وہ افراد جنہیں ہم نے اپنے زمانہ میں دیکھا ہے، ان میں بھی بہت سے ایسے افراد ہیں جو اپنے قوۂ خیالیہ کے مالک اور اس پر مسلط ہیں۔ یعنی خدا کی عبادت اور بندگی کے زیر اثر وہ اپنے اندر ایسی قوت پیدا کر چکے ہیں کہ اگر وہ چاہیں کہ مسلسل ایک گھنٹہ اپنے ذہن کو ایک نقطہ پر اس طرح مرکوز رکھیں کہ اس پورے وقت میں ان کا ذہن ذرہ برابر بھی کسی اور شے کی طرف متوجہ نہ ہو، تو وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ یہ خود ایک قدرت اور تسلط ہے جو خداوند تبارک وتعالی سے واقعی قرب کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس قسم کی چیز ممکن ہے۔ بنیادی طور پر ان لوگوں کی اہمیت اسی بنا پر ہے کہ وہ اپنی فکر اور اپنے خیال پر حاکم ہیں، فکر و خیال ان پر حکومت نہیں کرتے۔ یہ بات مولانا روم نے کتنے اچھے انداز سے بیان کی ہے! پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے:

"ینام عینی ولا ینام قلبی"

"میری آنکھ تو سوتی ہے مگر دل بیدار رہتا ہے۔"

لیکن ہم جیسے انسانوں کی حالت اس سے مختلف ہے۔ ہماری آنکھ بیدار ہے لیکن دل عالم خواب میں ہے۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری آنکھیں سوتی ہیں مگر دل بیدار ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

گفت پیغمبر کہ عینای ینام

لاینام القلب عن رب الانام

کیا خوب کہا ہے:

چشم تو بیدار و دل رفتہ بہ خواب

چشم من در خواب و دل در فتح یاب

حاکم اندیشہ ام محکوم نی

چون کہ بنا حاکم آمد بر بنی

میری اور میرے خیال کی مثل معمار اور عمارت کی سی ہے، اسے میں نے بنایا ہے، فکر و خیال نے مجھے نہیں۔

من چو مرغ او جم اندیشہ مگس کی بود بر من مگس را دسترس

یہ دوسرا یا ایک اعتبار سے تیسرا وہ مرحلہ ہے جہاں انسان تسلط اور قدرت پیدا کرتا ہے۔

روح جسم سے بے نیاز ہو جاتی ہے

کیا دوسرے مراحل بھی ہیں؟ اگرچہ یہ مراحل ہماری سطح فکر اور تصورات سے بالا ہیں لیکن صرف تصورات سے بلند ہونا اس بات کا عذر

نہیں ہوسکتا کہ ہم انہیں نہ پہچانیں اور ان سے بے خبر رہیں۔ جی ہاں، ایک بالاتر مرحلہ بھی ہے البتہ یہ خیال نہ کیجئے گا کہ جن مراحل کے بارے میں ہم گفتگو کر رہے ہیں، وہ امام یا پیغمبر سے مخصوص ہیں۔ امام اور پیغمبر کے مرحلہ تک پہنچنے سے پہلے بہت سے مراحل ہیں۔ انسان خداوند عالم سے تقرب کے نتیجہ میں یہ مقام صرف اور صرف عبودیت واخلاص، خضوع وخشوع اور فناء فی اللہ ہو جانے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ ایک ایسے مرحلہ پر پہنچ جاتا ہے کہ باوجود اس کے کہ اس کا بدن روح کا محتاج ہوتا ہے اس کی روح بدن سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔

مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

اس وقت ہماری روح ہمارے بدن کی محتاج ہے اور ہمارا بدن بھی ہماری روح کا محتاج ہے۔ اس وقت اگر روح اور حیات نہ ہو تو ہمارا یہ بدن زندہ نہیں رہے گا۔ اگر ہمارا یہ بدن بھی نہ ہو، تو ہماری روح بھی یہاں کسی کام کی نہ رہے گی۔

لیکن کیا تمام انسان اسی طرح کے ہیں کہ ان کا بدن بھی روح کی ضرورت رکھتا ہے اور ان کی روح بھی بدن کی محتاج ہوتی ہے؟ یا یہ کہ بعض انسان خدا سے تقرب اور پروردگار کی عبودیت کے نتیجہ میں اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ کم از کم ان کی روح ان کے بدن سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔

روح کیسے بے نیاز ہوتی ہے؟

بندے یہ قدرت حاصل کر لیتے ہیں کہ روح کو بدن سے الگ کر لیں البتہ یہاں روح جسم سے الگ کرنے کے معنی مر جانا نہیں ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ بدن کے مقابل روح کے استقلال کو محفوظ رکھتے ہیں۔

خود ہمارے زمانہ میں ایسے اشخاص موجود ہیں کہ جو روح کو جدا کر لینے کی قدرت رکھتے ہیں۔ واقعی وہ روح کو بدن سے جدا کر لیتے ہیں، اس طرح کہ اپنے آپ کو اس بدن پر مسلط دیکھتے ہیں۔ اپنے بدن کو دیکھتے ہیں کہ مثلاً یہاں عبادت میں مشغول ہے اور وہ خود کسی دوسری جگہ کی سیر کر رہے ہوتے ہیں۔ ایک وسیع ترین دریچہ ان کے سامنے کھلا ہوتا ہے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی، جو "شیخ الاشراق" کے نام سے معروف ہیں ان کی ایک عبارت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم حکیم کو اس وقت تک حکیم نہیں سمجھتے، جب تک اس میں اس بات کی قدرت نہ ہو کہ اپنی روح کو بدن سے علیحدہ کر لے۔ میر داماد کہتے ہیں: ہم کسی حکیم کو حکیم صرف اسی وقت سمجھتے ہیں جب بدن کو (روح سے) سے خالی کرانا اس کے لئے ملکہ بن چکا ہو۔ یعنی جب بھی وہ ارادہ کرے، اپنی روح کو بدن سے جدا کر سکے۔

ہمارے لئے یہ باتیں انتہائی سخت ہیں۔ ہم ایسی باتوں پر یقین نہیں کر پاتے۔ ہمیں ان پر یقین نہ رکھنے کا حق بھی ہے۔ کیونکہ ہم ان مراحل

سے بہت دور ہیں۔ لیکن اس بدگمانی اور بے یقینی سے ذرا اوپر اٹھئے۔ ہم تو نہیں گئے ہیں، ہم نے تو عبودیت کے راستہ کے اس پہلے ہی مرحلہ کو طے نہیں کیا ہے تاکہ دیکھ سکیں کہ خدا کی عبادت کا اتنا اثر بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ ہم نے کبھی ماہ رمضان میں، ایک بھی صحیح روزہ نہیں رکھا ہے۔ آپ اسی ماہ رمضان میں حقیقتاً تجربہ کر کے دیکھئے۔ آپ دنیا کے تمام کاموں میں تجربہ کرتے ہیں۔ ایک ماہ رمضان میں بھی تجربہ کیجئے اور ایک واقعی روزہ، ایسا روزہ جیسا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے اور ائمہ اطہار نے حکم دیا ہے رکھئے۔ یعنی پہلے تو روزے کے ظاہر پر، جو کھانے پینے کی اشیا اور کچھ دوسری چیزوں کو ترک کرنا ہے، عمل کیجئے۔ البتہ یہ کام ہم سب کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ روزہ جسے حدیث میں خاص روزہ کہا گیا ہے، اس روزے کو بھی رکھ کر دیکھئے۔ یعنی اس ایک ماہ میں، صرف ہمارا دل روزہ سے نہ ہو بلکہ زبان بھی روزہ رکھے۔ ماہ رمضان میں کوشش کریں کہ ہماری زبان غیبت نہ کرے، جھوٹ نہ بولے، خواہ یہ جھوٹ اس کے انتہائی فائدے میں ہو۔ زبان روزہ نہ توڑے، جھوٹ نہ بولے، کیونکہ روزہ صرف کھانے سے پرہیز کا نام نہیں ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"رب صائم لاحظ له الا الجوع والعطش"

"بہت سے روزہ دار ایسے ہوتے ہیں، جن کے حصہ میں روزے

سے سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ نہیں آتا۔"

ہماری زبان بیہودہ اور لغو باتیں نہ کہے، وہ الفاظ جو ہماری دینوی زندگی یا ہماری آخرت کے لئے ضروری ہوں ان کے سوا کوئی لفظ نہ بولے۔ ہمارے کان غیبت نہ سنیں، لہو ولعب نہ سنیں، فحش کلامی نہ سنیں۔ ہماری آنکھیں دوسروں کی عزت وآبرو پر نہ اٹھیں۔ ہمارے ہاتھ خیانت کے لئے دراز نہ ہوں۔ ہمارے قدم خیانت اور ظلم کی طرف نہ بڑھیں۔ بلکہ اس کے برعکس اس ماہ رمضان کو اطعام یعنی دوسروں کو کھانا کھلانے، دلجوئی، محبت، احسان اور خدمت کا مہینہ قرار دیں۔

تجربہ کیجئے صرف ایک ماہ رمضان میں انسان بننے کی کوشش کیجئے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ ایک ماہ بعد عبادت اور عبودیت اور اپنا اثر دکھاتی ہے یا نہیں۔ پھر محسوس کیجئے گا کہ ایک مہینہ بعد یہی روزہ آپ کو بدلتا ہے یا نہیں، ایک مہینہ بعد یہی روزہ آپ کو ربوبیت یعنی تسلط وقدرت دیتا ہے یا نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتو آپ کو حق ہے کہ آپ ان مراحل کا انکار کریں۔ لیکن اگر آپ نے یہ دیکھا کہ نہیں اس ایک مہینہ میں آپ نے اس قدر ربوبیت، قدرت وتسلط حاصل کرلیا ہے اور اپنے نفس پر، اپنی جبلتوں اور شہوات پر، اپنے اعضا وجوارح پر کنٹرول حاصل کرلیا ہے تو، پھر یقین کر لیجئے گا کہ وہ اگلے مراحل بھی حقیقت رکھتے ہیں۔

بدن پر تسلط کی قدرت

کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی مرحلہ ہے؟ کیا عبودیت کی یہ سواری انسان کو اس سے بھی زیادہ خدا سے نزدیک کر سکتی ہے اور کیا انسان کو اس سے بھی زیادہ قدرت وتوانائی دے سکتی ہے؟

جی ہاں، نہ صرف یہ کہ انسان کا اپنے بدن سے رابطہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ جہاں روح بدن سے مستقل اور بے نیاز ہو جاتی ہے بلکہ وہ مرحلہ بھی آتا ہے کہ انسان اپنے بدن کا جیسے بھی استعمال کرنا چاہے کر لیتا ہے۔ حتی وہ یہ قدرت بھی حاصل کر لیتا ہے کہ ایک گھنٹہ تک اپنی حرکت قلب کو روک لے اور پھر بھی نہ مرے۔ اس بات کی قدرت حاصل کر لیتا ہے کہ دو گھنٹے سانس نہ لے پھر بھی نہ مرے۔ اس بات کی قدرت حاصل کر لیتا ہے کہ اس بدن کے ساتھ طی الارض کرے۔ شاید آپ میں سے بہت سے لوگوں کے لئے ایسی باتوں پر یقین کرنا مشکل ہو گا مگر یہ حقیقت ہے۔ ہاں! انسان ایسی قدرت حاصل کر لیتا ہے۔ یہ عبادت کا اثر ہے۔

بیرونی دنیا پر تسلط کی قدرت

کیا اس کے بعد کا بھی کوئی مرحلہ ہے؟ جی ہاں، اگر آپ گھبرائیں نہیں تو عرض کروں کہ اس سے بلند تر مرحلہ بھی ہے۔ اس کے بعد کا مرحلہ یہ ہے کہ انسان خدا کی بندگی اور عبودیت کے نتیجہ میں اس ذات اقدس اور منبع وجود سے اتنا نزدیک ہو جاتا ہے کہ اس قربت کے باعث اس امر پر قادر ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا کو بھی جیسے چاہے استعمال میں لائے؛ عصا کو اژدہے میں بدل لے، چاند کے دو ٹکڑے کر لے، چشم زدن میں تخت بلقیس یمن سے فلسطین لے آئے۔ جی ہاں، وہ ایسا کر سکتا ہے:

"العبودية جوهرة كنهها الربوبية"

لیکن یہ مراحل ہم سے بہت دور ہیں۔ آیئے ہم اپنے ہی مرحلہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

آج کی رات جس میں ہم یہاں اکٹھا ہوئے ہیں بیداری کی رات ہے اور ہمیں جاگتے رہنا ہے یہ اپنی جگہ! لیکن اس رات کو جہاں ایک اعتبار سے برکت و سعادت حاصل ہے وہیں ایک اعتبار سے اس میں نحوست اور بدشگونی بھی پائی جاتی ہے۔ نحوست اس اعتبار سے ہے کہ اس رات کو ہم علی

بن ابی طالب علیہما السلام کی ذات سے محروم ہوئے تھے اور مبارک اس لحاظ سے کہ حضرت علیؑ کا ہمارے درمیان سے رخصت ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی رخصتی ہے جو واقعاً "مبارکباد" کی حامل ہے۔ جیسے کہ "صعصعہ بن صوحان عبدی" امیر المومنین علیہ السلام کے دفن کی شب، جب آپ کی قبر کے سرہانے آ کر کے کھڑے ہو گئے۔ وہ اور چند اور امیر المومنین علیہ السلام کے خاص ساتھی جنہیں امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے اس موقع پر بلایا تھا وہاں موجود تھے۔ صعصعہ بن صوحان نے کہا کہ کیسی اچھی زندگی بسر کی اور کیسی بلند مرتبہ موت پائی۔

آج احیاء اور بیداری کی شب بھی ہے اور وہ رات بھی ہے جس کا تعلق امیر المومنین علیہ السلام سے ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کو دوسروں کی نسبت کیا خصوصیت اور امتیاز حاصل ہے کہ آپ مولا کے اس قدر گرویدہ ہیں؟ علیؑ کی آپ سے کیا رشتہ داری ہے؟ کوئی نہیں۔ علیؑ کا آپ سے کیا مادی تعلق ہے؟ کسی قسم کا مادی تعلق نہیں ہے۔ علیؑ کا امتیاز اور ان کی خصوصیت کیا ہے؟ علیؑ کی خصوصیت عبودیت اور بندگی ہے۔ علیؑ خدا کے ایک کامل صالح بندہ ہیں۔ ایک ایسے بندہ ہیں جو زندگی کے سوا کسی اور بات کے بارے میں نہیں سوچتے۔ وہ بندہ ہیں جنہوں نے ربوبیت اور تسلط کے ان تمام مراحل کو، جن کے متعلق ہم نے عرض کیا اعلیٰ حد تک طے کر لیا ہے۔ ایک ایسے

بندے ہیں جو ہمیشہ خدا کو اپنے اعمال پر حاضر و ناظر سمجھتے ہیں۔

مالک اشتر نخعی کو بلند مرتبہ اور ظریف ولطیف نکات پر مشتمل خط ارسال کیا ہے۔ مالک اشتر کے نام حضرت علی علیہ السلام کا یہ خط اسلام کے معجزات میں سے ہے جو نہج البلاغہ میں موجود ہے۔ انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے کہ چودہ سو سال پہلے، ایسی گنوار اور وحشی قوم کے درمیان ایک ایسا عظیم الشان قانون حکمرانی جسے دیکھکر محسوس ہو کہ اسے انیسویں صدی میں کچھ فلاسفہ نے بیٹھ کر تحریر کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ لوگ جو معجزہ کی تلاش میں رہتے ہیں، وہ خیال کرتے ہیں کہ بس معجزہ یہ ہے کہ عصا، اژدہا بن جائے۔ یہ معجزہ عوام کے لئے ہے۔ علماء و دانشور حضرات کے لئے دعائے کمیل، دعائے ابوحمزہ ثمالی اور مناجات شعبانیہ معجزہ ہیں، مالک اشتر کے نام حضرت علی علیہ السلام کا یہ خط معجزہ ہے۔ اس میں آپ تحریر فرماتے ہیں: مالک! خیال نہ کرنا کہ اب جب کہ تم مصر گئے ہو، تو ان لوگوں کے والی اور ان سے برتر ہو گئے ہو اور لوگوں کو اپنی رعایا سمجھنے لگو۔ لہذا ایک درندے بھیڑیے کی طرح جو دل چاہے کرتے پھرو۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ آپؑ لوگوں کی تقسیم اس طرح کرتے ہیں: جو مسلمان ہیں، وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور جو مسلمان نہیں ہیں وہ تمہاری ہی طرح کے انسان ہیں۔ جو ہماری گفتگو سے متعلق بات ہے وہ یہ ہے کہ آپؑ فرماتے ہیں:

"مالك!فانك فوقهم"

تم اپنی رعیت پر بالادست بنائے گئے ہو۔ وہ محکوم ہیں اور تم حاکم۔

لیکن "والی الا مرعلیك فوقك" جس نے یہ خط تمہارے نام تحریر کیا یہ قانون تمہارے سپرد کیا ہے وہ میں ہوں جو تم سے اوپر ہوں۔ میں تم پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔ اگر تم نے کوئی غلطی کی تو تمہیں اس کی سزا دوں گا۔

"والله فوق من ولاك" (۱) اور پروردگار اقدس کی ذات اس کے اوپر ہے جس نے تمہیں مصر کے لوگوں کا حاکم بنایا ہے۔ خدا علیؑ سے اوپر ہے اور علیؑ ہمیشہ اپنے خدا سے خوفزدہ رہتا ہے کہ کہیں کوئی خطا سرزد نہ ہو جائے۔

دوسرا مرحلہ، جو خیال اور فکر کے تمرکز کا مرحلہ ہے اس کے تعلق سے اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ علی نماز میں کھڑے ہوتے ہیں، خدا اور عبادت میں ایسے ڈوب جاتے ہیں کہ پاؤں سے تیر کھینچ لیا جاتا ہے اور علیؑ کو محسوس تک نہیں ہوتا جبکہ اگر عام حالت میں تیر نکالا جاتا تو ظاہر ہے کہ شدید تکلیف اور درد کا سامنا ہوتا۔

حضرت علی علیہ السلام کو جو عظمت و منزلت حاصل ہے وہ آپ کی شخصیت کے انہی پہلوؤں کی وجہ سے ہے۔ حضرت علی علیہ السلام ایک ایسے

---

(۱) نہج البلاغہ، مکتوب ۵۳

مرحلہ پر پہنچ چکے ہیں کہ طی الارض اور اس طرح کے مسائل آپ کے لئے انتہائی آسان ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ایک جاہل ونادان شخص نے کہا ہے کہ ایک ڈیڑھ میٹر یا دو میٹر کے انسان (یعنی العیاذ باللہ علی ابن ابی طالب علیہما السلام) کے لئے جو اس قدر فضائل اور معجزات بیان کئے جاتے ہیں وہ گڑھے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس قسم کے مسائل کا تعلق انسان کے قد سے ہے۔ لہٰذا جس کا قد دو میٹر ہو اس میں زیادہ امکان ہے۔ پھر تو ایسے انسانوں کی نظر میں اگر دنیا میں کوئی معجزہ وجود رکھتا ہے تو اس کا تعلق ''اوج بن عنق'' سے ہونا چاہئے۔ کیونکہ وہ عظیم الجثہ تھا۔ یہ لوگ انسان کو پہچانا کیوں نہیں چاہتے؟ کیوں خدا کو نہیں پہچاننا چاہتے؟ کیوں تقرب الٰہی کو نہیں سمجھنا چاہتے؟ کیوں عبودیت کے معنی نہیں سمجھنا چاہتے؟ ولایت تکوینی کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا نے دنیا کے کام کو نعوذ باللہ ایک انسان کے سپرد کر دیا ہے اور خود ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا ہے یہ محال ہے۔ ولایت تکوینی سے مراد یہ ہے کہ بنیادی طور پر عبودیت کا پہلا قدم ولایت ہے۔ لیکن درجہ بدرجہ (ولایت یعنی تسلط وقدرت) اس کا پہلا درجہ یہ ہے کہ وہ ہاتھ کا مالک ہو جائے، آنکھ کا مالک ہو جائے، کان کا مالک ہو جائے، اپنے پیر کا مالک ہو جائے، اپنی جبلتوں کا مالک ہو جائے، دوسرا قدم یہ کہ اپنے فکر وخیال کا مالک

ہو جائے، اپنے بدن کے مقابل اپنے نفس کا مالک ہو جائے۔ قدم بقدم (آگے بڑھتا ہے) یہاں تک کہ عالم تکوین پر بھی کچھ تسلط حاصل کر لیتا ہے۔ پھر یہ باتیں نہیں کیا کرتا، یہ باتیں شعور و معرفت کے فقدان کا نتیجہ ہیں۔ ہمیں علی اس لئے محبوب ہیں اور ہم اس لئے علیؑ کے گرویدہ ہیں کہ یہ بات انسان کی فطرت میں پوشیدہ ہے کہ وہ صاحبان فضیلت سے محبت رکھتا ہے۔ یہ وہ ذات ہے جس کی نظر میں خدا کے سامنے اپنی کوئی حیثیت نہیں ،اس کی نظر میں جو کچھ ہے خدا ہے،اس کے سوا اسے کچھ نظر نہیں آتا۔

علیؑ بستر شہادت پر

آیئے پروردگار کے اس صالح بندے کی عیادت کو چلتے ہیں۔ آج کی رات علی کے بچوں کے لئے ،علی کے شیعوں اور دوستوں کے لئے انتہائی غم کی رات ہے۔

کم و بیش بہت سے لوگ سمجھ چکے تھے کہ علیؑ اس مسموم ضربت سے نہیں بچ سکیں گے۔ جیسا کہ آپ نے سنا ہے علیؑ نے جنگ خندق میں عمرو بن عبدود سے ایک سخت ضربت کھائی تھی، یہ ضرب علی کے فرق نازنین پر پڑی تھی اور سر کو توڑتی ہوئی امام کے سر میں ایک شگاف کا باعث بنی تھی۔

البتہ ایسی نہ تھی کہ خطرناک ہوتی اور بعد کے مرحلہ میں امام نے عمرو کو زمین پر دے مارا تھا۔ یہ زخم صحیح ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس لعین ابدی ابن ملجم کی ضربت اسی جگہ پر پڑی تھی، جہاں اس سے پہلے عمرو بن عبدود کی ضربت لگی تھی۔ حضرت علی علیہ السلام کے سر اقدس میں ایک بڑا اشگاف پڑ گیا تھا۔ بہت سے لوگوں کو اب بھی اس بات کی امید تھی کہ علی صحت یاب ہو جائیں گے۔ حضرت علی کے بچوں میں سے ایک، ظاہراً ان کی صاحبزادی ام کلثوم کی عبدالرحمٰن ابن ملجم پر نظر پڑی جو وہاں سے گذر رہا تھا، انہوں نے کہا: اے لعین! مجھے امید ہے کہ تیری تمنا پوری نہ ہوگی، خدا میرے والد کو شفا عنایت کرے گا۔ (ابن ملجم) مسکرایا اور کہا کہ میں نے اس تلوار کو ہزار درہم میں خریدا ہے، یہ بہت کارآمد تلوار ہے، میں نے اسے زہر سے بجھانے کے ہزار درہم ادا کئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ضربت جو میں نے تمہارے باپ کے سر پر لگائی ہے، اگر اسے تمام انسانوں پر تقسیم کیا جائے، تو سب مر جائیں گے۔ لہٰذا تمہارے بابا کو بھی یہ زہر قتل کر دے گا۔ اس بات نے علی کے بچوں کی امیدوں کو توڑ دیا۔ طبیب کو بلایا گیا۔ ایک شخص ہے جس کا نام ''ہانی بن عمرو سلولی'' ہے، ظاہراً یہ شخص (جیسا کہ ایک مرتبہ میں نے تاریخ میں پڑھا) ایسا طبیب تھا جس نے ''جندی شاپور'' کی یونیورسٹی سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی، یہ یونیورسٹی ایران میں تھی اور ایران کے عیسائی اسے چلاتے تھے۔

یہ شخص کوفہ میں مقیم تھا۔لوگ گئے اور اسے لے کر آئے کہ معائنہ کرے، بلکہ ہو سکے تو علاج کرے۔لکھا ہے کہ اس نے ایک بھیڑ یا بکرے کو ذبح کرنے کو کہا۔اس کے پھیپھڑے سے اس نے ایک رگ باہر نکالی، اس رگ کو گرم گرم اس زخم کے جگہ میں داخل کیا، دیکھنا چاہتا تھا کہ زہر کا اثر کتنا ہے، جاننا چاہتا تھا کہ زہر کتنا پھیل چکا ہے،ان باتوں کو اس سے زیادہ میں نہیں جانتا۔ لیکن صرف اتنا جانتا ہوں کہ تاریخ میں یہ لکھا ہے۔ یہ شخص اپنی طبی معائنہ سے فارغ ہوا تو خاموش ہو گیا، کوئی لفظ منہ سے نہ نکالا۔ اس کے بعد امیر المومنین کی طرف رخ کر کے عرض کیا: اے امیر المومنین! اگر آپ کی کوئی وصیت ہو تو کر دیجئے۔ بس کیا تھا! اب آپ کے اہل خانہ، اعزاء واحباب اور شیعوں کی امیدیں ٹوٹ گئیں۔

علیؑ محبت اور بغض دونوں کا مرکز ہیں۔ آپ کے ایسے ایسے محب ہیں جو آپ سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور آپ کے دشمن بھی انتہائی شدید ہیں، جیسے عبد الرحمٰن ابن ملجم۔ اسی طرح آپ کے دوست بھی عجیب وغریب تھے۔ ان دو راتوں اور دنوں میں، حضرت علیؑ کے چاہنے والوں کا عجیب حال تھا، آپ کے گھر کے گرد جمع تھے اور آپ کی عیادت کی اجازت طلب کر رہے تھے۔ سب کہہ رہے تھے کہ ایک بار ہمیں اپنے مولا کے جمال کے دیدار کی اجازت دے دیجئے۔ کیا ممکن ہے کہ ہم ایک مرتبہ پھر علیؑ کی آواز

سن سکیں، علیؑ کا رخ انور دیکھ سکیں؟ انہیں میں سے ایک ''اصبغ بن نباتہ'' ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ لوگ علیؑ کے گھر کے گرد جمع ہیں، مضطرب ہیں اور گریہ و بکا کر رہے ہیں، سب اندر جانے کی اجازت کے منتظر ہیں۔ یکایک میں نے دیکھا کہ امام حسنؑ باہر تشریف لائے اور اپنے والد بزگوار کی طرف سے لوگوں سے ان کی محبت کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد فرمایا: اے لوگو! میرے والد کی حالت ایسی نہیں ہے کہ آپ ان سے ملاقات کر سکیں۔ والد صاحب نے آپ سے معذرت چاہی ہے اور فرمایا ہے کہ آپ سب اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں، چلے جایئے، یہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میرے لئے آپ سے ملاقات ممکن نہیں۔ لوگ چلے گئے۔ میں نے بھی بہت چاہا کہ میں بھی چلا جاؤں لیکن نہ جا سکا۔ میرے قدموں میں جانے کی طاقت ہی نہیں رہی تھی۔ میں کھڑا رہا۔ امام حسنؑ ایک مرتبہ پھر تشریف لائے۔ مجھے دیکھا اور کہا: اصبغ کیا تم نے نہیں سنا کہ میں نے کیا کہا ہے؟ میں نے عرض کیا: جی آقا سنا ہے۔ فرمایا: کیوں نہیں گئے؟ میں نے عرض کیا: میرا دل جانے کو تیار نہیں ہوتا، میرا دل چاہتا ہے کہ کسی طرح ایک مرتبہ اپنے آقا کی زیارت کر لوں۔ امام تشریف لے گئے اور میرے لئے اجازت لے لی۔ میں امیر المومنینؑ کے سرہانے پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ کے سر پر زرد رومال باندھا گیا ہے۔ میں تعین نہیں کر پا رہا تھا

کہ علی کا چہرہ اقدس زیادہ زرد ہے یا وہ رومال۔

بعض نے کہا ہے کہ تلوار کی ضربت اور اس زہر کے مقابلہ میں حضرت علی علیہ السلام کے بدن کی قوت مدافعت ایک غیر معمولی بات ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ علی ضربت لگتے ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے۔ ان آخری لمحات میں علی کبھی بے ہوش ہوتے کبھی ہوش میں آتے۔ جب آپ ہوش میں آتے تھے تو آپ کی زبان مقدس پر ذکر خدا اور وعظ و نصیحت جاری ہو جاتی تھی۔ کیسی کیسی نصیحتیں، کیسے کیسے موعظے، کیسی کیسی باتیں۔

اب اس موقع پر آپؑ کی اولاد کے سوا کوئی آپ کے پاس نہیں تھا۔ بس آخری جملہ اور زحمت تمام۔ آپؑ کی اولاد پروانہ وار آپ کے بستر کے گرد حلقہ زن تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ کبھی بابا باتیں کرنے لگتے ہیں اور کبھی نڈھال ہو جاتے ہیں۔ ہم نے ایک مرتبہ آپؑ کی آواز سنی، جیسے آپؑ کسی سے باتیں کر رہے ہوں۔ فرشتوں کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں:

"ارفقوا ملائك ربی بی"

میرے خدا کے فرشتو جو میرا روح قبض کرنے لئے آئے ہو، میرے ساتھ نرمی کا سلوک کرنا۔ ایک مرتبہ علیؑ کی آواز بلند ہوئی:

یہ علیؑ کے الفاظ تھے۔ میں خدا کی وحدانیت کی گواہی دیتا ہوں، میں پیغمبرؐ کی رسالت کی شہادت دیتا ہوں۔ (اس کے بعد) آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور گھر سے نالہ وشیون کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔(۱)

(۱) تقریر کے آخری چند سیکنڈ کیسٹ میں رکارڈ نہیں ہوئے ہیں۔

عبادت ونماز

(۳)

"یاایها الذین آمنوا اذکروا الله ذِکرا کثِیرا وسبِحوه بکرة واصِیلا"(۱)

نماز کی اہمیت

ہمیں احادیث وروایات میں عبادت سے متلعق کچھ ایسی چیزیں ملتی ہیں جن سے ذہن میں کچھ سوالات ابھرتے ہیں؛ جیسے نماز کے بارے میں کہا جاتا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے یا ائمہ اطہار علیہم السلام کا فرمان ہے:(۲)

(۱) ایمان والو! کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا کرو اور صبح وشام اس کی تسبیح کیا کرو۔(سورۂ احزاب ۴۱،۴۲)

"الصلوۃ عمود الدین"(۳)

یعنی اگر ہم دین کو ایک نصب شدہ خیمہ سمجھیں، جس میں چادر بھی ہے، رسی بھی ہے، زمین میں گڑی بڑی بڑی کیلیں بھی ہیں اور ایک ستون بھی جس نے اس خیمہ کو کھڑا کر رکھا ہے تو نماز اس نصب شدہ خیمہ کے ستون کی مانند ہے۔

رسول کریمؐ سے منقول حدیث میں خاص طور پر یہ بات بالکل اسی طرح بیان کی گئی ہے جس طرح ہم نے آپ کی خدمت میں عرض کیا ہے۔

نماز کے بارے میں روایت ہے:

"ان قبلت قبل ما سواھا و ان ردت رد ما سواھا"

مراد یہ ہے کہ انسان کے تمام اعمال کی قبولیت کی شرط نماز کی قبولیت ہے۔ یعنی اگر انسان کوئی نیک عمل انجام دے لیکن نماز نہ پڑھے، یا نماز پڑھے لیکن صحیح ڈھنگ سے نہ پڑھے، ایسی نماز پڑھے جو بارگاہ الٰہی میں قبول نہ کی جائے بلکہ مسترد کر دی جائے تو ایسی صورت میں اس کے دوسرے تمام نیک اعمال بھی مسترد کر دیے جائیں گے۔ انسان کے تمام نیک اعمال

---

(۲) کیونکہ یہ چیز پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلمات میں بھی پائی جاتی ہے اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے فرمودات میں بھی موجود ہے۔

(۳) نماز دین کا ستون ہے۔ (وسائل الشیعہ، ج ۳، ص ۲۳، ح ۱۳)

کی قبولیت اس کی نماز کی قبولیت پر منحصر ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے:

"الصلوۃ قربان کل تقی"

"نماز ہر متقی کے لئے وسیلہ تقرب ہے۔"

(نہج البلاغہ، کلمات قصار ۱۳۶)

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ شیطان اس وقت تک مومن سے دور اور اس سے ناراض رہتا ہے جب تک وہ اپنی نماز کی حفاظت اور پابندی کرتا ہے۔

احادیث و روایات میں کثرت کے ساتھ اس طرح کی باتیں ملتی ہیں، حتی خود آیات قرآنی سے اس مفہوم یعنی نماز کی غیر معمولی اہمیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اس بارے میں اٹھنے والا ایک سوال گاہے بہ گاہے کچھ لوگوں کی زبان پر آتا ہے، وہ یہ ہے کہ نماز کی اہمیت کے بارے میں اتنی زیادہ احادیث میں سے کچھ تو ضرور جعلی ہوں گی، درست نہ ہوں گی، صحیح اور معتبر نہ ہوں گی، پیغمبر یا ائمہ اطہار کے کلام کا حصہ نہ ہوں گی؟ ان احادیث کو شاید اس دور میں گڑھا گیا ہوگا جس میں عالم اسلام میں زاہد و عبادت گذار افراد کی کثرت ہوگئی تھی، یہ اس دور کی گڑھی ہوئی ہوں

گی جب (اسلامی دنیا) میں زہد و عبادت کا بازار گرم تھا خاص طور پر دوسری اور تیسری صدی ہجری میں جب کہ زاہد مسلک اور عبادت میں حد سے گذر جانے والے افراد ظاہر ہوئے تھے، جو کم و بیش رہبانیت اختیار کر چکے تھے۔

زاہد اور صوفی نما لوگ

ہم دیکھتے ہیں کہ جس وقت سے دنیائے اسلام میں تصوف نے جنم لیا، اسی دور سے ایسے افراد پیدا ہو گئے تھے جو دیگر اسلامی فرائض و واجبات کو بھلا کر اپنی ساری طاقتیں صرف عبادت اور نماز میں صرف کرتے تھے۔

مثال کے طور پر ہمیں حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب میں ربیع بن خثیم نامی ایک شخص ملتا ہے۔ یہ وہی معروف خواجہ ربیع ہیں جن سے منسوب ایک قبر مشہد مقدس میں ہے۔ اب میں یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ قبر انہی کی ہے یا نہیں، مجھے اس بارے میں خاص معلومات نہیں۔ البتہ اس بارے میں شک نہیں کہ یہ "زہاد ثمانیہ" یعنی دنیائے اسلام کے آٹھ معروف زاہدوں میں سے ایک شمار کیے جاتے ہیں۔

ربیع بن خثیم کے زہد و عبادت کا یہ عالم تھا کہ اپنی عمر کے آخری دور

میں(۱) انہوں نے اپنی قبر کھودی اور وقتاً فوقتاً جا کے اس قبر میں لیٹ جایا کرتے اور اپنے آپ کو وعظ و نصیحت کرتے۔ قبر میں لیٹ کر اپنے آپ سے کہتے کہ یہ نہ بھلا بیٹھنا کہ آخرکار تمہیں یہیں آنا ہے۔

جب انہیں اطلاع ملی کہ لوگوں نے فرزند رسول حسین ابن علی علیہما السلام کو شہید کر دیا ہے تو انہوں نے اس اندوہناک واقعہ پر اظہار افسوس کے طور پر صرف اتنا کہا کہ: ''وائے ہو اس امت پر جس نے اپنے پیغمبر کے فرزند کو شہید کر دیا ہے۔'' اور یہ (اس بیس سال کے عرصہ میں) ذکر الٰہی اور دعا و مناجات کے سوا ان کی زبان سے ادا ہونے والا واحد جملہ تھا۔ کہتے ہیں کہ بعد میں انہوں نے استغفار کیا اور پشیمان ہوئے کہ آخر وہ یہ چند کلمات زبان پر کیوں لائے جو ذکر خدا نہ تھے۔

یہی ربیع بن خثیم امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے دور خلافت میں حضرت کی فوج میں شامل تھے۔ ایک روز امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

---

(۱) ربیع حضرت علی علیہ السلام کے بعد امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے زمانے تک حیات رہے، یہ تقریباً ۲۰ سال پر محیط عرصہ ہے۔ یعنی جس زمانے میں امام حسین کو شہید کیا گیا، یہ زندہ تھے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ پورے ۲۰ سال ان کا کام فقط اور فقط عبادت تھا اور اس عرصہ میں انہوں نے کوئی دنیاوی بات زبان سے ادا نہ کی۔

"یا امیر المومنین انا شککنا فی ھذا القتال"(۱)

اے امیر المومنین! ہمیں اس جنگ کے بارے میں شک ہے۔ ہمیں خدشہ ہے کہ کہیں یہ جنگ غیر شرعی نہ ہو۔ کیوں؟ کس وجہ سے؟ اس لئے کہ ہم اہل قبلہ مسلمانوں کے خلاف برسر پیکار ہیں، ہم ایسے لوگوں کے خلاف تلوار اٹھائے ہوئے ہیں جو ہماری مانند شہادتین پڑھتے ہیں، ہماری ہی طرح نماز ادا کرتے ہیں، ہماری ہی طرح رو بہ قبلہ کھڑے ہوتے ہیں۔

ربیع، امیر المومنین حضرت علیہ علیہ السلام کے شیعہ تھے اس لئے ان سے جدا بھی نہیں ہونا چاہتے تھے، لہٰذا کہتے ہیں: اے امیر المومنین! براہِ کرم میرے سپرد کوئی ایسا کام کیجئے جو شک وشبہہ سے پاک ہو۔ مجھے کسی ایسی جگہ، کسی ایسی ڈیوٹی پر بھیج دیجئے جس میں شک نہ ہو۔

امیر المومنین نے جب ان کی یہ حالت دیکھی تو فرمایا: بہت اچھا، اگر تم شک میں مبتلا ہو تو میں تمہیں ایک دوسری جگہ بھیج دیتا ہوں۔

معلوم نہیں خود انہوں نے اس جگہ جانے کی درخواست کی یا خود امیر المومنینؑ ہی نے فیصلہ کر کے انہیں مملکت اسلامی کی ایک سرحد پر بھیج دیا، وہاں بھی وہ سپاہی کی حیثیت سے تعینات تھے اور یہ ایک ایسی سرحد تھی کہ اگر

---

(۱) ان کے "انا" کہنے سے پتا چلتا ہے کہ وہ کئی لوگوں کے نمائندے کی حیثیت سے آئے تھے۔

اتفاق سے وہاں جنگ اور خونریزی کی نوبت آتی بھی تو دوسری طرف کفار یا بت پرست ہوتے، غیر مسلم ہوتے۔

جی ہاں، یہ تھا اس زمانہ کے زہاد اور عبادت گذار افراد کا ایک نمونہ۔

ایسا زاہد و عابد کس کام کا؟ کسی کام کا نہیں۔

ایک ایسا شخص جو حضرت علی علیہ السلام جیسی شخصیت کے لشکر میں شامل ہو۔ لیکن آپ کی دکھائی ہوئی راہ اور حکم جہاد کے بارے میں شک وشبہ کا شکار ہو، یہ خیال اس کے ذہن میں آئے کہ آپ کا حکم درست بھی ہے یا نہیں؟ اس موقع پر وہ احتیاط پر عمل کرے، احتیاط پر بنا رکھے۔ اسی جیسے آج بھی کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم کیوں مشکوک روزہ رکھیں؟ آپ دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے درمیان یہ بات بہت عام ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم کیوں ایسا روزہ رکھیں جس میں شک ہے، یہ بھی کوئی عمل ہوا؟ کیوں ایسی جگہ جنگ کریں جہاں شک ہو؟ ہمیں ایسی جگہ چلنا چاہئے جہاں رکھے جانے والے روزے میں شک نہ ہو۔

اس بات کی کیا اہمیت ہے؟

اسلام بصیرت کا تقاضا کرتا ہے۔ عمل بھی طلب کرتا ہے۔ بصیرت بھی۔ یہ خواجہ ربیع بصیرت کے حامل نہ تھے۔ انہوں نے معاویہ اور یزید جیسے ظالم کے دور میں زندگی بسر کی۔ دور معاویہ جس میں دین خدا میں تبدیلیاں

کی گئیں، بدعتیں ایجاد کی گئیں۔ یزید جو تاریخ اسلام کے بھیانک ترین جرائم کا مرتکب ہوا، اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام تر کوششوں اور محنتوں پر پانی پھیر دینے کے درپے ہوا۔ لیکن ایسے دور میں خواجہ ربیع گوشہ نشینی اختیار کر کے شب و روز مسلسل نماز میں مشغول رہتے ہیں، ذکر الٰہی کے سوا کوئی کلمہ ان کی زبان سے ادا نہیں ہوتا اور اگر حسین ابن علی علیہما السلام کی شہادت پر افسوس کے اظہار کے لئے ایک جملہ اگر زبان سے نکل بھی جاتا ہے تو بعد میں اپنے اس عمل پر پشیمان ہوتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ تو دنیوی بات ہوگئی، میں نے اس کے بجائے ''سبحان اللہ سبحان اللہ'' کیوں نہ کہا؟ اس کی جگہ ''یا حی یا قیوم'' کیوں نہ کہا؟ اللہ اکبر اور ''لاحول ولا قوۃ الا باللہ'' کیوں نہ پڑھا؟

یہ طرز عمل اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا:

''لا تری الجاهل الا مفرطا او مفرّطا''

''جاہل کو یا حد سے بڑھا ہوا پاؤ گے یا پھر اس سے بہت پیچھے۔''

(نہج البلاغہ، کلمات قصار ۶۲)

جاہل یا تو بہت آگے بڑھ جاتا ہے یا بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔

دین کے بارے میں ایک غلط تصور

ایک گروہ کا کہنا ہے کہ:

"الصلوۃ عمود الدین"

"نماز دین کا ستون ہے۔"

یہ بات کسی بھی طرح اسلامی تعلیمات سے موافق نہیں۔ کیونکہ دین اسلام تو سب چیزوں سے زیادہ اجتماعی مسائل کو اہمیت دیتا ہے: اسلام تو "ان اللّٰہ یامر بالعدلِ والاحسانِ "(۱) کا دین ہے۔ اسلام تو "لقدا رسلنا رسلنا بالبینٰتِ ونزلنا معھم الکِتاب والمِیزان لِیقوم الناس بالقِسط"(۲)

اسلام ایسی باتوں کا دین ہے۔ اسلام تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دین ہے:

---

(۱) "بے شک اللہ عدل واحسان کا حکم دیتا ہے۔" (سورہ نحل۔۹۰)

(۲) بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا ہے، تا کہ لوگ انصاف کے ساتھ قیام کریں۔ (سورہ حدید ۲۵)

"کنتم خیر امة اخرِجت لِلناسِ تامرون بِالمعروفِ وتنھون عن المنکرِ"(۱)

اسلام جہد مسلسل اور کوشش اور عمل کا دین ہے۔ اسلام ایک عظیم دین ہے۔ ایک ایسا دین جو مذکورہ مسائل کو اتنی اہمیت دیتا ہے، کیسے ممکن ہے کہ وہ عبادت کے لئے اتنی زیادہ اہمیت کا قائل ہو؟ نہیں، دین اسلام میں عبادت کے مسئلے کو اتنی زیادہ اہمیت حاصل نہیں۔ ہمیں اسلام کی اخلاقی اور اجتماعی تعلیمات کے نفاذ کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔ عبادت بے کار لوگوں کا مشغلہ ہے۔ جنہیں کوئی اہم ترین کام نہ ہو وہ نماز پڑھیں، عبادت کریں۔ لیکن ایک ایسا شخص جس کے سامنے اہم ترین کام ہوں اس کے لئے لازم نہیں کہ وہ عبادت بجالائے۔

یہ بھی ایک غلط فکر ہے اور انتہائی خطرناک بھی۔ اسلام جیسا ہے اسے ویسا ہی سمجھنا چاہئے۔

میرے ان معروضات کی وجہ یہ ہے کہ ان چیزوں کو میں اپنے معاشرہ میں ایک بیماری کی صورت میں محسوس کر رہا ہوں۔ انتہائی افسوس کی

---

(۱) تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے منظر عام پر لایا گیا ہے۔ تم لوگوں کو نیکوں کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو۔ (سورۂ آل عمران ۱۱۰)

بات ہے کہ اس وقت ہمارے معاشرے میں جو لوگ اسلام کا نعرہ بلند کررہے ہیں ان میں اکثر، سب کو نہیں کہتا دو گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ایک گروہ وہ ربیع بن خثیم جیسے طرز فکر کا حامل ہے، خواجہ ربیع کی طرح سوچتا ہے۔ایسے لوگوں کے نزدیک ''اسلام'' ذکر ودعا کرنے، نوافل پڑھ لینے، زیارات پر جانے اور زیارت عاشورہ کی قرأت کا نام ہے۔ایسے افراد کے نزدیک اسلام کے معنی مفاتیح الجنان اور زاد المعاد ہے جو دعاؤں کے دو معروف کتابیں ہیں ان کا پورا کا پورا اسلام مفاتیح الجنان میں سمٹ آیا ہے۔اس کے سوا ان کے نزدیک کسی اور چیز کا وجود ہی نہیں، یہ لوگ بالکل ربیع بن خثیم کی سی سوچ رکھتے ہیں۔انہیں دنیا سے کوئی سروکار نہیں، مسائل زندگیسے کوئی غرض ہی نہیں، اسلام کی اجتماعی تعلیمات سے کوئی مطلب نہیں، اسلامی اصول وارکان سے کوئی لگاؤ نہیں، اسلامی تربیت سے کوئی واسطہ نہیں۔انہیں سرے سے کسی بھی چیز سے مطلب نہیں۔

ان لوگوں کی تفریط کے رد عمل میں ایک افراطی طبقہ پیدا ہوا ہے۔یہ طبقہ اسلام کے اجتماعی مسائل کو اہمیت دیتا ہے، ان کے بارے میں حساسیت کا اظہار بھی کرتا ہے۔اس پہلو سے یہ لوگ قابل قدر ہیں۔لیکن انہی لوگوں میں سے کچھ لوگوں کو بعض اوقات میں دیکھتا ہوں کہ مثال کے طور پر مستطیع ہونے کے باوجود حج کو نہیں جاتے۔یہ شخص مسلمانوں سے،

اسلام سے واقعی لگاؤ رکھتا ہے، اس کا دل اسلام کے لئے دھڑکتا ہے، لیکن مستطیع ہوتے ہوئے بھی حج کو نہیں جاتا، اس کی نظر میں حج کی کوئی اہمیت ہی نہیں، تقلید ضروری ہے لیکن اسے اہمیت نہیں دیتا۔ حالانکہ تقلید ایک معقول بات ہے۔

تقلید کسے کہتے ہیں؟

کہا جاتا ہے کہ یا تو آپ، نماز، روزہ جیسی چیزوں کے مسائل کو مصادر شرع سے براہ راست خود حاصل کیجئے۔ یعنی اس میدان میں اس قدر ماہر ہو جائیے کہ اس مہارت کے بل پر خود استنباط کرسکیں۔ یا پھر یہ کہ احتیاط پر عمل کیجئے، جو خود ایک خاصا دشوار کام ہے۔ یا پھر ایک ماہر جامع الشرائط عادل شخص کا انتخاب کیجئے اور جس طرح ایک ماہر طبیب سے رجوع کر کے اس کے بتائے ہوئے نسخہ پر عمل کرتے ہیں اسی طرح دینیات میں اس کی رائے پر بھی عمل کیجئے۔ انسان بغیر تقلید کے رہ ہی نہیں سکتا۔ یعنی اگر وہ تقلید نہ کرے تو اپنے آپ کو بہت زیادہ مشکل میں ڈال لے گا۔

اسی طرح بعض لوگ روزے کو اہمیت نہیں دیتے۔ اگر کسی سفر کی وجہ سے ان کا روزہ قضا ہو جائے تو اس قضا کو ادا نہیں کرتے۔ یہ لوگ بھی اپنے آپ کو ایک کامل مسلمان سمجھتے ہیں۔ وہ بیان شدہ گروہ بھی خود کو کامل مسلمان سمجھتا ہے، جب کہ نہ یہ کامل مسلمان ہیں نہ وہ۔

دین اسلام "نؤمن ببعض ونکفر ببعض" (۱) سے اتفاق نہیں کرتا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ انسان اسلامی عبادات کو تو اپنائے لیکن اس کے معاشرتی اور اخلاقی قوانین سے سروکار نہ رکھے، اس کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اختیار نہ کرے۔ اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ انسان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو لے لے، اور اسلامی عبادات کو چھوڑ دے۔

قرآن مجید جہاں کہیں بھی "اقیمو الصلوٰۃ" کہتا ہے، اس کے فوراً بعد "آتو الزکوۃ" کہتا ہے۔ اگر "اقام الصلوۃ" کہتا ہے تو اس کے بعد "آتی الزکاۃ" کہتا ہے۔ جب "یقیمون الصلوۃ" کہتا ہے تو اس کے بعد "یؤتون الزکوٰۃ" کہتا ہے۔ "یقیمون الصلوٰۃ" کا تعلق بندے اور خدا کے درمیان رابطہ سے اور "یؤتون الزکوٰۃ" کا ربط بندگان خدا کے آپس کے تعلقات سے ہے۔

جس طرح ایک مسلمان کو اپنے اور اپنے رب کے درمیان ایک مستقل اور مسلسل رابطہ کی ضرورت ہے اسی طرح اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے اور معاشرے کے درمیان بھی ایک مستقل اور مسلسل رابطہ قائم رکھے۔

---

(۱) ہم بعض چیزوں پر ایمان لائیں گے اور بعض چیزوں کا انکار کریں گے۔" (سورہ نساء ۱۵۰)

بغیر عبادت کے، بغیر ذکر الہی کے، بغیر یاد خدا کے، بغیر مناجات کے، بغیر حضور قلب کے، بغیر نماز کے، بغیر روزہ کے ایک اسلامی معاشرہ تشکیل نہیں پاسکتا، حتی خود انسان بھی صحیح و سالم نہیں رہ سکتا۔

اسی طرح بغیر ایک سالم معاشرہ کے، بغیر ایک اچھے ماحول کے، بغیر امر بالمعروف کے، بغیر نہی عن المنکر کے، بغیر مسلمانوں سے پیار و محبت کے اور بغیر دوسروں کی مدد اور ان کے ساتھ تعاون کے انسان ایک اچھا عبادت گذار بندہ نہیں بن سکتا۔

علیؑ ایک جامع الصفات ہستی

آپ اگر حضرت علی ابن ابی طالب علیہما السلام کی حیات پر ایک سرسری نگاہ بھی ڈالیں تو پتہ چل جائے گا کہ آپ ایک عابد بلکہ دنیا کے سب سے بڑے عابد ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کی عبادت تمام عالم میں ضرب المثل بن جاتی ہے۔ عبادت بھی ایسی کہ فقط خم و راست ہونا نہیں، بے روح رکوع و سجود نہیں بلکہ ایسی عبادت جو اول سے آخر تک جذبات، ولولہ، عشق الہی اور گریہ و زاری سے لبریز ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد "ضرار" نامی ایک شخص کی